بصائر

امام رضا علیہ السلام

فإنّ الناس لو عَلِموا محاسنَ کلامِنا لَاتَّبعونا

اگر لوگ ہمارے کلام کی خوبصورتی کو جان لیں تو ہماری اتباع کریں گے۔

سرپرست:

حجۃ الاسلام والمسلمین جناب ڈاکٹر رضا شاکری

(نمایندہ محترم جامعۃ المصطفیٰ برای ہند)

مدیر اعلیٰ:

ڈاکٹر ذیشان حیدر عارفی

مدیر:

سید تقی عباس رضوی کلکتوی

مجلس مشاورت

سید اصل نژاد، سید فیاض حسین، سید منظور عالم جعفری، علی عباس حمیدی

اطہر حسین جعفری

نمایندگی جامعہ المصطفیٰ العالمیہ -۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی

مقالہ نگاروں کی ذاتی آراء اور بیانات و نتائج سے "بصائر" کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

قالَ أَميرُ الْمُؤْمِنينَ عليه السلام:

شَهْرُ رَمَضانَ شَهْرُ اللهِ وَ شَعْبانَ شَهْرُ رَسُولِ اللهِ وَ رَجَبٍ شَهْرِی. مولا علی علیہ السلام نے فرمایا: ماہ رمضان اللہ کا مہینہ، ماہ شعبان رسول خدا کا اور ماہ رجب میرا مہینہ ہے۔ [وسائل الشیعہ، ج ۷، ص ۲۶۶، ح ۲۳.]

فہرست مطالب

- اداریہ:..............................ادارہ.............................۴
- حمد باری.............................ظہور مولائی.............................۵
- اسلامی مناسبتیں.............................ادارہ.............................۶
- رجب اور شعبان ماہ رمضان میں داخل ہونے کا مقدمہ.............................رئیس نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ رضا شاکری.............۷
- آغاز آفرینش.............................علامہ علی نقی نقن طاب ثراہ.............................۹
- بعثت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ کے اہداف و مقاصد.............................سید محمد مجتبی علی رضوی.............................۱۳
- آیہ «عفا اللہ عنک...اور عصمتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.............................محمد تقی رضا.............................۱۹
- محسن اسلام (حضرت ابو طالبؑ).............................علامہ ذیشان حیدر جوادی کلیم الہ آبادی.............................۲۴
- مولا علی علیہ السلام کی نظر میں دشمن کی شناخت اور اس سے مقابلہ.............................زائر عباس.............................۲۵
- کردار علیؑ کی انفرادیت.............................ڈاکٹر رونق زیدی.............................۲۹
- حضرت علیؑ اور جویریہ کی خواستگاری کا افسانہ.............................ترتیب و تالیف مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم.............۳۳
- حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی سیرت میں عفت و پردہ داری.............................ڈاکٹر شاذیہ مہدی.............................۳۷
- مدح حضرت زینبؑ.............................شہید محسن نقوی.............................۴۲
- امام باقر علیہ السلام علماء اہل سنت کی نظر میں.............................نثار احمد.............................۴۳
- حضرت امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام کے چند قرآنی احتجاجات.............................ظہور مہدی مولائی.............................۴۷
- شیعوں کی راہنمائی میں امام محمد تقی علیہ السلام کا سیاسی اور اجتماعی کردار.............................علی عباس حمیدی.............................۵۱
- امام سجادؑ کی نگاہ میں صحت و تندرستی.............................سید پیغمبر عباس بشر نوگانوی.............................۵۵
- مدح باب الحوائج.............................حیدر علی محشر بڈہانوی.............................۶۰
- عباس ابن علیؑ عالمِ بشریت اور جہانِ ہستی کا اک چمکتا ہوا مہتاب !.............................سید تقی عباس رضوی کلکتوی.............................۶۱
- جناب علی اکبر علیہ السلام اور ہماری جوان نسل.............................سید نجیب الحسن زیدی.............................۶۹
- مدح امام عصر عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف/علامہ اقبال.............................سجاد اطہر موسوی.............................۷۴
- عصر غیبت میں خواتین کی فردی اور اجتماعی ذمہ داریاں.............................سید منظور عالم جعفری.............................۷۵
- مناجات شعبانیہ اور طرز زندگی.............................علی خضر عمرانی.............................۸۱
- اسلامی معاشرہ میں نفاق کے اسباب و نتائج (آخری قسط).............................فیروز علی بنارسی.............................۸۷
- مسلمانوں کی بے حسی کے اسباب اور ان کا معالجہ.............................سید علی ہاشم عابدی.............................۹۳
- آیت اللہ سید نجم الحسن رضوی.............................سید رضی حیدر پھندیڑوی.............................۹۹
- نذر وطن.............................حیرت مراد آبادی.............................۱۰۲

****

اداریہ

ہر طرف پر آشوب زمانہ ہے ریاکاری، بے دینی، انحراف، کجروی، دغل بازی عام ہیں آخر الزمان کی اکثر علامات ہر طرف دکھائی دے رہی ہیں ایک طرف بے پردگی اپنے عروج کی طرف رواں دواں ہے تو دوسری طرف پردہ کرنے والی عورتوں اور نامحرم سے بچنے والی خواتین کو عقب افتادہ تصور کیا جاتا ہے شادیوں میں کھڑے ہو کر کھانا کھانا، دلھن کو مجمع عام میں اسٹیج پر بٹھا کر دلھا کے ساتھ فوٹو لینا اور فوٹو گرافی کے لئے باہر سے نامحرم مرد کو بلا کر بجی دھجی دلھن اور دیگر گھر کی خواتین کی فوٹو گرافی کرانا اسی طرح فضول خرچی اور دیگر غیر شرعی امور کا انجام دینا ایک عام بات ہے. اسی طرح اموات میں شرکت کرنے سے پتا چلتا ہے کہ لوگ موت سے اتنے غافل ہو گئے کہ لگتا ہے ان کو موت ہی نہیں آئے گی کیونکہ ان کے اندر نہ خوف ہے نہ ہراس، بلکہ وہاں بیٹھ کر بھی ذکر خدا کے بدلے غیبت اور دنیوی باتیں ہوتی ہیں مرحومین کے تیجے، دسوے اور چالیسویں سے بھی غم کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ وہاں بھی اولاد مرحوم کو ثواب پہچانے کے بجائے اپنی عزت اور آبرو کے بارے میں سوچتی ہیں اس کی قضا نماز ادا کرانے کے بجائے اور اپنی بہنوں کو باپ کی میراث دینے بجاے یہ سوچتی ہے کہ دسویں یا چالیسویں میں کس مشہور ذاکر اور مشہور مرثیہ خوان کو بلایا جائے کھانے میں کیا دیا جائے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ بچوں نے اپنے باپ یا ماں کا دسواں یا چالیسواں کس شان سے کیا ہے اسی طرح خطیب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بانی مجلس اور حاضرین مجلس خوش ہو جائیں کاش ان سب کا ہدف یہ ہوتا کہ ہمارا خدا خوش ہو جائے. اسی طرح زیارتوں پر جانے والے کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مقدس مقامات پر جانے کے بعد بھی ریاکاری سے باز نہیں آتے زیارت بعد میں ہوتی ہے فوٹو ایر پورٹ سے ہی کھینچنے شروع ہو جاتے ہیں ضریح کے پاس بعد میں جاتے ہیں سیلفی لینا پہلے شروع کر دیتے ہیں جو چند مرتبہ زیارت کے لئے جا چکے ہوں وہ بغیر پوچھے ہی بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ ہماتی بار زیارت کر چکے ہیں، زیارتوں میں بھی آداب زیارت کی رعایت نہیں کرتے زیارت پر جا کر خریداری کے بارے میں پہلے سوچتے ہیں بیٹیوں کے لئے کیا لیں بچوں کے لئے کیا لے جائیں پڑیسوں کے لئے کیا لے جائیں ادھر زیارت سے آنے کے بعد رشتہ داروں کے سوالات ہمارے لئے کیا لائے ہماری انگوٹھی کہاں ہماری نماز کی چادر وغیرہ وغیرہ کہاں ہے لگتا ہے زائر زیارت کے لئے نہیں شوپنگ کے لئے گیا تھا۔ اسی طرح تجارت میں کہیں گران فروشی ہے تو کہیں جھوٹ بلکہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کیا کریں بغیر جھوٹ کے کام نہیں چلتا ہر طرف خواہش نفس پر عمل ہو رہا ہے.

حوزات علمیہ پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ ان کے بانی اور مدیران اپنے بعد مدرسہ کی باگ ڈور آیا اپنے لائق، شائستہ، مومن اور ممتاز شاگرد کے حوالے کرتے ہیں یا اپنی نالائق اولاد کے؟ ان تمام چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد پتہ چلے گا کہ ہم لوگوں کو آخرت کا خوف ہے یا نہیں ہم لوگ مومن، شیعہ، اہل بیت علیہم السلام کے عاشق کہے جانے کے لائق ہیں کہ نہیں؟ آخر ہمارا معاشرہ ایسا کیوں ہو گیا؟ ہمارے اوپر نصیحتوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی کیا وجوہات ہیں کہیں شکم تو مال حرام سے پر نہیں ہیں؟ اس کی جو بھی وجہ ہو ہم کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے ورنہ ہماری انتظار میں ایسا عذاب ہے کہ جس کو زمین اور آسمان بھی برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتے تو ہمارا ضعیف و ناتوان جسم کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ خدا سے پناہ مانگتے ہیں

نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ کی ایک کوشش یہ ہے کہ وہ علمی، فکری، اصلاحی، تاریخی، اخلاقی اور دیگر زندہ موضوعات کے قالب میں مجلہ بصائر کی شکل میں مقالات پیش کریں الحمد للہ یہ نواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے خداوند عالم سے دعا گو ہیں کہ اس مجلہ میں ہر طرح سے ہمکاری کرنے والوں طول عمر کے ساتھ ان کے مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ آمین۔

حمد باری تعالی

جو فاطر الارض والسما ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے
جو ذرے ذرے کو جانتا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

جو کاشف الکرب والبلا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے
ہر اک کو جو رزق دے رہا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

کیا ہے جس نے ہر اک کو پیدا، جو خود ہر اک شے سے ہے ھویدا
جو کل جہاں کو چلا رہا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہوا، خلا اور فضائے ہستی، سنا رہی ہیں ثنائیں جس کی
فلک بھی گن جس کے گا رہا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

حیات بخشی ہے جس نے سب کو، بنایا جس نے ہے روز و شب کو
جو چاند سورج نکالتا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہیں کل خلائق اسی کی خلقت، ہر اک پہ ہے فرض اس کی طاعت
یہی تو قرآن کہہ رہا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہے ذرے ذرے میں جس کی قدرت، وہ جس کی ہر شے پہ ہے حکومت
جو سارے عالم کو پالتا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہے جس نے فرش زمیں بچھایا، ہے جس نے عرش بریں سجایا
جو نور تاروں کو بانٹتا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہے جس نے آب رواں بنایا، ہے جس نے کھیتوں کو لہلہایا
جو ابر و باراں کو بھیجتا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

وطن ہیں جس کے چمن ہیں جس کے، فرات و گنگ و جمن ہیں جس کے
زمیں کو جو ان سے سینچتا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

کسی مکاں میں مکیں نہیں ہے، ہر اک کی فطرت سے جو قریں ہے
جو سب کا معبود اور خدا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہر اک زمین و زماں ہیں جس کے، ہر اک مکین و مکاں ہیں جس کے
مگر وہ ان سب سے ماورا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

یہ آب و نان و ثمر ہیں جس کے، یہ کوہ و دشت و شجر ہیں جس کے
جو مالکِ ملک دوسرا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

ہماری دولت ہے جس کی الفت، ہماری عزت ہے جس کی طاعت
وہ جس کی قربت میں ارتقا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

سکون جاں جس کی بندگی ہے، کہ جس پہ مرنا ہی زندگی ہے
جو واقعاً دائم البقا ہے، وہی تو خلاق دو جہاں ہے

جو عیب و شر سے ہے پاک و بالا، احد ہے جو اور علی و اعلیٰ
ظہور، جو ذات، لافنا ہے وہی تو خلاق دو جہاں ہے

* * * *

اسلامی مناسبتیں

• ماہ رجب کی اہم مناسبتیں

۱-رجب، ولادت امام محمد باقر علیہ السلام ۵۷ھ ق

۳-رجب، شہادت امام علی نقی علیہ السلام ۲۵۴ھ ق

۱۰-رجب،ولادت امام محمد تقی ۱۹۵ ھ ق

۱۳ -رجب، ولادت امام علی علیہ السلام

۱۴-رجب،وفات حضرت زینب علیہا السلام ۶۳ ھ ق

۱۸ -رجب،وفات ابراہیم فرزند پیامبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۲۵ -رجب،شہادت امام موسی کاظم علیہ السلام ۱۸۳ھ ق

۲۶-رجب، وفات محسن اسلام حضرت ابوطالب علیہ السلام

۲۷ -رجب،مبعث پیامبر گرامی ۱۳ سال قبل از ہجرت

۲۸ -رجب،امام حسین علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی ۶۰ھ ق

• ماہ شعبان کی اہم مناسبتیں

۴۔شعبان المعظم

ولادت باسعادت حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام ۲۶ھ ق

۵۔شعبان المعظم

ولادت باسعادت امام زین العابدین علیہ السلام ۳۱ھ ق

۱۱۔شعبان المعظم

ولادت باسعادت حضرت علی اکبر علیہ السلام ۳۳ھ ق

۱۴۔شعبان المعظم

شب برائت

۱۵۔شعبان المعظم

ولادت باسعادت منجی عالم بشریت امام مہدی عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف ۲۵۵ھ ق

رجب اور شعبان ماہ رمضان میں داخل ہونے کا مقدمہ

رئیس نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ حجۃ الاسلام رضا شاکری

بزرگانِ معنویت اور عرفاء نے ماہِ رجب اور ماہ شعبان کو ماہِ رمضان کا آغاز قرار دیا ہے۔ رجب اور، شعبان کا مہینہ، ایک طرح کی آمادگی ہے تاکہ لوگ تیاری کے ساتھ رمضان کے مقدس مہینے میں داخل ہوسکیں جو خدا کی مہمان نوازی کا مہینہ ہے۔

مؤمن یاعلی کے ذکر کے ساتھ رجب کے مہینے میں کہ جس میں مولا علیؑ کی ولادت ہے داخل ہوتا ہے اور اپنے کو استغفار، توبہ اور انابہ کے ذریعہ پاک کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ کو تمام نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرتا ہے، شب قدر میں کہ جو مولائے کائنات کی شہادت کی شب بھی ہے خداوند عالم سے امیر المومنینؑ کی مصاحبت کا پروانہ اخذ کرتا ہے اور اس طرح اپنے لئے بہترین تقدیر رقم کرتا ہے ایسا شخص مذکورہ اعمال کے ساتھ ماہ رمضان میں داخل ہوتا ہے تو ضیافت الٰہی کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے

ماہ رجب کی اہمیت خود اس میں پائی جانے والی مناسبتوں کی وجہ سے بھی ہے جن میں سب سے پہلے امام باقر علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہے اس مہینے کے آخر میں تاریخ کا سب سے بڑا مبارک واقعہ رونما ہوا۔ یعنی پیغمبر ﷺ مبعوث بر سالت ہوئے ،مہینہ کے وسط میں مولائے متقیان علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولادت باسعادت، اور اعتکاف کے خاص ایام ہیں کہ جن میں انسان کو فانی دنیا سے بے توجہ ہوکر خدا کی طرف خالص توجہ دینا چاہئے . یہ مہینہ، خدا سے خلوت کا مہینہ ہے لہذا اس میں ایسی دعائیں پڑھے جو انسان کو توحید میں غرق کر دے۔ اس لئے رجب کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور توسل کا مہینہ ہے خدا سے دعا اور اس کی بارگاہ میں آہ وزاری کرنے کی بہار ہے۔

اس کے بعد شعبان کا مہینہ ہے؛ جو نور اور رحمتوں سے بھرا ہوا ہے، یہ وہ مہینہ ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کا ارشاد ہے:"شعبان شهری، رحم الله من اعاننی علی شهری" "شعبان میرا مہینہ ہے خدا رحمت فرمائے اس پر جو اس میں میری مدد کرے.

شعبان ان مہینوں میں سے ایک ہے جو اہل ایمان بالخصوص سالکین اور نیک بندوں کی نگاہ میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس ماہ کی فطری عظمت سے قطع نظر جو کہ معصومین علیہم السلام کے کلام و عملی سیرت سے آشکار ہے.

اس مبارک مہینہ میں امام حسین، امام سجاد ،علمدار کربلا ابوالفضل العباس اور امام زمان علیہم السلام کی ولادت باسعادت بھی ہے جس سے اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

دوسری طرف مناجات شعبانیہ جیسی دعاؤں نے اس مہینے کو ایک خاص مقام بخشا ہے جن کی سال کے تمام دنوں میں خاص طور پر شعبان کے دنوں میں تاکید ہوئی ہے یہ دعائیں ہم تک امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ سے پہنچیں، دیگر ائمہ علیہم السلام بھی ان کو پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔

اسی طرح ان کی پیروی میں عظیم ہستیوں نے بھی ان کے پڑھنے کا اہتمام کیا جن میں جمہوریہ اسلامی ایران کے رہبر کبیر امام خمینیؒ ہیں جو ان مناجات کو مستقل پڑھتے تھے۔

امید ہے کہ تمام احباب ان مقدس مہینوں کی برکات سے نہ صرف خود استفادہ کریں گے بلکہ دوسروں کو بھی ان سے استفادہ کرنے کی تلقین و تشویق کریں گے۔

اس مجلہ میں ماہ رجب اور شعبان میں پائی جانے والی اہم ترین مناسبتوں کو اہمیت دیتے ہوئے ان کو سرنامہ مقالات قرار دیا گیا ہے

ان با فضیلت ایام میں خداوند متعال سے آپ تمام حضرات کی دعا کی مقبولیت کا طالب ہوں، اسی کے ساتھ امیدوار ہوں کہ ان بابرکت ایام میں اپنی دعاوں میں شامل فرمائیں گے.

* * *

شعبان المعظم ہجری کیلنڈر کا آٹھواں مہینہ ہے، یہ "شعب" سے مشتق ہے اور چونکہ اس مہینے میں مومنین کی رزق و روزی اور حسنات میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اسلئے اس مہینے کو "شعبان" نام دیا گیا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جو ختم المرتبت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شعبان کے مہینے میں روزہ رکھتے تھے اور اسے ماہ رمضان کے ساتھ متصل کرتے تھے۔

آغاز آفرینش

انتخاب از تاریخ اسلام علامہ سید علی نقی نقن

اللہ ہی اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ پھر اس کی مشیت کے اشارہ سے ایک جوہرِ نور پیدا ہوا جس سے عدم کی ہمہ گیر ظلمت وجود کی صلاحیتوں سے جگمگا اٹھی۔ اس ایک نور کے احاطہ میں تیرہ نور اور چمک رہے تھے۔ ان انوار کی کرنوں میں جو فضا بن کر محیط ہوئیں اس کے بعد تو لاکھوں چھوٹے بڑے نور اپنی اپنی تڑپ دکھانے لگے۔ زمانہ تھا نہیں تاکہ وقت بتایا جاسکے کہ کب تک یہ عالم رہا۔ پھر عمومی طور پر ارواح کی پیدائش ہوئی۔ جنہوں نے روشنی کے ساتھ ماسوی اللہ کے لئے زندگی کی ہوا چلائی۔ قیامت تک کی پیدا ہونے والی ذی روح مخلوق آج اپنے ارادہ و شعور کے جوہر سمیت جمع تھی اور اس وقت خالق نے ان سے اپنی معرفت اور اطاعت کا اقرار لیا اور سب نے اس کا عہد و پیمان باندھا۔ نہ کہنے والے کو خطاب میں زبان درکار تھی نہ سننے والوں کو کانوں کی احتیاج وہ جسم و جسمانیت سے بری اور یہ بھی ابھی جسمیت سے بے لوث۔ اس سوال و جواب کا مضمون جب ہمارے سنانے کے لئے الفاظ کے قالب میں آیا تو ''الست بربکم'' کے سوال اور ''بلی'' کے جواب سے اس کا ماحصل معلوم ہوا۔

روح کے بعد مادہ کی باری آئی۔ مادہ کے ساتھ ساتھ صورت کی جلوہ گری ہوئی۔ پہلی صورت جس کا عالم مادی میں پتہ چلتا ہے مادہ پانی اور ہوا کی ہے۔ نیچے پانی اور اوپر ہوا۔ پھر ہوا کے جھونکے اس پانی کے اندر چلے اور ان کے تھپیڑوں سے اس پانی میں تموج پیدا ہوا۔ پانی کے جوش و خروش سے کف پیدا ہوا اور بخارات بلند ہوئے۔ یہ بخارات فضائے ہوا میں بلند ہو کر محیط ہو گئے جو آسمان کہلائے۔ اس میں سات طبقے قرار دیئے گئے اور ان ساتوں آسمانوں میں ملائکہ کی عظیم الشان بستی بسائی گئی۔ یہ مادی کثافتوں اور گناہ کی آلائشوں سے بری پاک مخلوق ہیں جن کا کام صرف اللہ کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے۔ عالم طبیعت کے انتظام و تدبیر کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ اسے احکام الٰہی کے ماتحت انجام دیں۔ انہیں آسمانوں میں ہزاروں ثوابت اور سیارے چمکائے۔ ان میں کوئی سورج ہے اور کوئی چاند اور کچھ ستارے ہیں۔ جو سورج کے ارد گرد چکر لگاتے ہیں

پانی کی سطح پر تھوڑے حصہ میں خالق کے ارادے نے اسی کف کی موٹی تہ ایسی جمادی جیسے دودھ پر بالائی ہوتی ہے۔ اس تہ کا نام زمین ہوا اور جس جگہ سے یہ جمنا شروع ہوئی تھی اس کا نام مکہ قرار پایا جہاں مسلمان حج کو جاتے ہیں مگر زمین کے اِدھر ادھر چاروں طرف اور پھر نیچے پانی ہی پانی تھا جو تھپیڑے مار رہا تھا اس لئے وہ ڈانواں ڈول اور بے قرار تھی۔ اسے بھاری بھر کم بنانے کے لئے

پہاڑ پیدا ہوئے جو اس میں میخوں کی طرح گڑ گئے۔ پہاڑوں سے چشمے پھوٹے جنہوں نے خشک زمینوں کی سیرابی کا انتظام کیا۔ اونچے اونچے ٹیلے اور دور افتادہ مقامات جن تک چشموں کا پانی نہیں پہنچ سکتا تھا ان کے لئے بادل پیدا ہوئے جو پانی کا خزانہ لے کر سفر کرتے اور ان دور افتادہ مقامات کو اپنی بارش سے سیراب کرتے ہیں۔ اب ان چشموں کی آبیاری اور ان بادلوں کی آب باری سے زمین کی سوئی ہوئی نمو کی طاقتوں نے کروٹ لی۔ اس میں زندگی پیدا ہوئی۔ سبزہ لہلہانے لگا اور طرح طرح کے درخت، بیل بوٹے سطح زمین پر جھومنے اور لہریں لینے لگے۔ اب عالم میں رنگ و بو کی کوئی کمی نہ تھی مگر سوا سمندر کے خروش اور چشموں کی روانی یا کبھی بادلوں کی کڑک اور گرج کے کوئی آواز نہ تھی مگر جب ان درختوں کے پھلوں اور پتیوں نے خوان رزق چن لیا تو عالم کے سناٹے کو چہل پہل سے تبدیلی کرنے کے لئے بہت سی جاندار مخلوق، رنگ برنگ کے حیوانات عدم کے سمندر سے نکل کر وجود کے ساحل پر اکٹھا ہونے لگے اور چرند پرند بہائم اور درندوں کا ایک جھمگٹا لگ گیا اور شور برپا ہو گیا مگر اس مخلوق میں حرکت اور ارادے کی تنظیم کے لئے شعور نہ تھا۔ یہ پوری کارگاہ ڈکتے ہوئے شیروں لپکتے ہوئے بھیڑیوں اور ڈسنے والے اژدہوں سے محشرستان بنی ہوئی تھی۔ اس کی تنظیم کے لئے پہلے آگ سے پیدا کی ہوئی ایک مخلوق بنی جان کو برسرکار لایا گیا کہ اس نوع کو موقع آزمائش میں لاکر اس کو اپنی صلاحیتوں کی حد کا اندازہ کرا دیا جائے۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی حرارت مزاج سے اس دنیا میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکا دی اور دوسری کائنات میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی بجائے خود باہمی جنگ و جدال اور خونریزی سے فساد عظیم برپا کیا اور اپنے خالق کی اطاعت چھوڑ کر اس کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔

اس وقت آسمان پر نور کی پیداوار مخلوق تھی جسے ملک کہتے ہیں اور زمین پر بہ تار کی پیداوار تھی جسے جن کہتے ہیں۔ وہ ہمہ تن اطاعت و عبادت تھے اور یہ ہمہ تن کفر و معصیت بن گئے۔ اس لئے وہ ان کو دیکھ کر نالاں تھے۔ آخر خالق کا غضب نازل ہوا اور یہ پوری کی پوری قوم اس زمین سے بے دخل ہو گئی۔ ان میں - سے ایک جو اس وقت تک عابد و زاہد نظر آتا تھا اپنی اس عبادت کے نتیجہ میں بچا لیا گیا اور اسے عالم بالا کے بنے والے ملائکہ کی صفوں میں جگہ دے دی گئی۔ جہاں وہ ان کے ساتھ ایسا گھل مل گیا جیسے کہ ان ہی میں سے ہے اس کا نام عزازیل تھا جو بعد میں ابلیس اور شیطان کہلایا۔

اب خالق کی طرف سے فرشتوں کے درمیان ایک اعلان ہوا کہ میں زمین پر اپنی طرف سے ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں۔ فرشتے جو بنی جان کی خونریزی اور فساد دیکھ چکے تھے کہنے لگے کہ کیا ایسے کو مقرر کیا جائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی؟ حالانکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں۔ جواب ملا کہ جو میں جانتا ہوں اس کو تم نہیں جانتے۔ یعنی میرے کاموں میں جن کی حکمتیں راز میں ہیں تمہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔ پھر ایک دفعہ یہ اعلان ہو گیا کہ میں ایک مخصوص نوع مخلوق بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ جب میں اس کا پتلا تیار کر لوں اور اس میں اپنی پسند کی ہوئی خاص روح داخل کر لوں تو تم سب اس کے لئے سجدہ میں جھک جانا۔ اسے سب نے سن لیا اور اس وقت کسی نے انکار نہیں کیا۔ اب خالق نے اپنی قدرت کے انتظام

خاص سے شور و شیریں ہموار و ناہموار ہر طرح کی زمین سے خاک یکجا کرائی۔ پانی کی شرکت سے اس کا پیکر تیار ہوا جسے ہواؤں نے خشک کھنکڑ بنادیا اور اس کو اپنی پسندیدہ روح ڈال کر خدا نے جاندار بنایا۔

یہ انسان اول ابوالبشر آدم تھے۔

اب ملائکہ کو حکم ہوا کہ اس کے سجدے کے لئے جھک جاؤ۔ سب نے تو پیشانیاں سجدہ میں رکھ دیں مگر عزازیل نے انکار کر دیا اور کہا میری خلقت آگ سے ہے جو محل میں خاک سے بلند ہے۔ پھر بھلا میں اس کو کیونکر سجدہ کروں۔ یہ اس کا تکبر اور انکار غضب خالق کا سبب بنا اور حکم ہوا کہ نکل جا۔ ملاء اعلیٰ اور صفوف ملائکہ سے، وہ نکل تو گیا مگر اس نے انسان کی بلندی کے دعوے کو شکست دینے کے لئے خالق سے قیامت تک کی اپنے لئے مہلت لے لی کہ دیکھو تو سہی جو تمام انسانوں کو گمراہ کر کے دم لوں اور دکھادوں کہ یہ اس عزت کا حقدار نہیں ہے جو اسے دی گئی۔ خالق نے بھی اپنی بات بالا ہونے کے ثبوت اور اس کی حجت کو ختم کرنے کے لئے اسے مہلت دے دی کہ تو لاکھ کوشش کرے پھر بھی انسانوں میں میرے کچھ سچے اور اچھے بندے ایسے رہیں گے جو کسی طرح تیرے ورغلانے میں نہ آئیں گے اور حق اور نیکی کے راستے سے نہ ہٹیں گے۔

اب جو انسان گمراہی میں پڑتے اور فساد کے مرتکب ہوتے ہیں وہ اپنی بساط بھر شیطان کی بات پوری کرنے میں حصہ لے کر اس کے مددگار بنتے ہیں اور جو نیکی اور خداپرستی کے راستے پر قائم رہتے ہیں اور جو نیکی اور خداپرستی کے راستے پر قائم رہتے ہیں وہ اپنے خدا کی بات کو برقرار رکھتے اور اس کے مددگار قرار پاتے ہیں۔

آدم ہی کے پیکر کی بچی ہوئی مٹی سے صنف اناث کی پہلی فرد حوا کی پیدائش ہوئی جنہیں خالق نے آدم کا شریک زندگی قرار دیا اور ان دونوں کو کچھ مدت کے لئے جب تک اسے منظور ہوتا اپنے ایک مخصوص باغ پر بہار میں رہنے کا حکم دیا مگر اس وقت انہیں ایک خاص درخت کے قریب جانے سے روک دیا یہ کہہ کر کہ اگر اس درخت کے پاس گئے تو فوراً اس جنت سے باہر کر دیئے جاؤ گے۔ شیطان کہ جسے آدم کی بلندی اور عزت کی بنا پر ان سے پرخاش پیدا ہو گئی تھی حضرت حوا کے ذریعے سے آدم کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اس درخت کے قریب گئے بغیر اگر اس میں سے چکھ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ احتیاط کی رو سے بہتر ان کے لئے ہی تھا کہ وہ کم از کم اس بارے میں رب العزت سے اجازت حاصل کر لیتے مگر انہوں نے اس بارے میں تساہل سے کام لے کر بیوی کے مشورے ہی پر عمل کر لیا جس کا محرک دراصل بربنائے عداوت ابلیس ہوا تھا۔

اس درخت سے کھانا تھا کہ جنت کے لباس ان کے جسم سے اتر گئے اور خالق کے حکم سے فوراً ان کو اس جنت سے نکل کر اس دنیا میں آنے کا حکم ہو گیا۔ جہاں ایک وقت میں تو انہیں آنا ہی تھا اس لئے کہ وہ اسی زمین کی خلافت کے لئے تو پیدا ہی کئے گئے تھے۔ اب انہیں اپنے کئے کا پچھتاوا بہت ہوا اور انہوں نے خالق کی بارگاہ میں بڑی توبہ و انابت کی جسے بالآخر اللہ نے قبول کیا۔ مگر

بہر حال اب انہیں اس دنیا میں آنا لازم تھا جسے اب ان کی اولاد ہی سے آباد ہونا تھا۔ چنانچہ وہ اترے اور اب ان کے اولاد ہونا شروع ہوئی جس میں اللہ نے بڑی کثرت و برکت عطا فرمائی کیونکہ ان ہی سے اس پوری زمین کی بستی بسانا تھا۔

خدا نے آدم کو نظام زندگی میں دخل رکھنے والی ہر ضروری چیز کا علم دے کر بھیجا تھا۔ ایسا جو زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہو سکے اور پھر وہ ان کے ذریعے سے ان کی اولاد تک پہنچے تو اس علم کے سہارے سے وہ انسانی فکر و نظر کے ساتھ باقی مجہول اشیاء تک پہنچ کر اپنی اختیاری ترقی کے درجوں کو طے کر سکیں مگر اب بڑا مسئلہ نسل آدم کے آگے بڑھنے کے لئے ان کی اولاد کی شادی کا تھا کیونکہ نوع انسانی میں سگے بھائی بہنوں کی شادی کی سنت کا جاری ہونا صحیح نہ تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے میں جنت کی حوروں اور بنی جان کے باقی ماندہ نیک افراد سے کام لیا گیا اور اس طرح نسل انسانی آگے بڑھی۔

آدم کے یوں تو بہت سے بیٹے تھے مگر ایک فرزند شیثؑ اپنے باپ کے کمالات کے حامل تھے۔ میں ان کے جانشین قرار پائے۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے بیٹوں میں دو بھائی قابیل اور ہابیل تھے۔ یہ دونوں بھائی صفات و کردار میں مختلف تھے۔ ہابیل نیکو کار تھے اور قابیل نافرجام۔ ایک تو طبیعتوں کا اختلاف پھر ہابیل کی نیکی کا نتیجہ یہ تھا کہ باپ کی نظر عنایت ان پر زیادہ تھی۔ یہ قابیل کے لئے ہابیل سے پرخاش کا سبب تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ دونوں نے بارگاہ الٰہی میں قربانیاں پیش کیں۔ اس زمانہ میں جس کی قربانی قبول ہوتی تھی ایک آگ آسمان سے اتر کر اس کی قربانی کو جلا دیتی تھی۔ اس آگ نے ہابیل کی قربانی کو آکر جلا دیا۔ اور قابیل کی قربانی خالص نیت سے نہ تھی۔ اس کو چھوڑ دیا۔ اب قابیل نے طے کر لیا کہ ہابیل کی زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔ اور ان سے بھی کہہ دیا کہ میں تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔ ہابیل نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ قربانی کی قبولیت خلوص و پاکیزگی کردار سے وابستہ ہوتی ہے۔ رہ گیا یہ کہ تم مجھ کو قتل کرنا چاہتے ہو تو اچھا تمہیں اختیار ہے مگر میرا ہاتھ تمہارے قتل کے لئے کبھی نہیں اٹھ سکتا۔ آخر قابیل نے ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ یہ پہلا خون تھا جو نوع انسانی میں زمین پر بہایا گیا۔ شیث کی اولاد پھولی پھلی اور دنیا میں پھیلی۔ ان میں برائیوں کے دور کرنے اور اچھائیوں کو رواج دینے کے لئے برابر ہادیان و معلمین آتے رہے جنہیں انبیاء و مرسلین کہتے ہیں اور جنہوں نے لاتعداد مشکلوں کا مقابلہ کر کے نوع انسانی کو بلندی کی منزل تک پہنچانے میں ہر امکانی کوشش صرف کی۔

نظری و عملی اعتبار سے جس ضابطہ حیات کی تبلیغ یہ انبیاءؑ کرتے رہے وہی دین اور شریعت ہے جس کے اصول ہمیشہ یکساں رہے اور وہی غیر متبدل اصول حقیقتاً دین اسلام ہیں۔

* * *

بعثت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہداف و مقاصد

سید محمد مجتبیٰ علی رضوی

تمہید

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ کی بعثت بشریت پر پروردگار عالم کا عظیم احسان ہے، کیونکہ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس زمانہ میں مبعوث بہ رسالت نہ ہوتے تو انسانیت فنا ہو جاتی۔ وہ ایسا دور تھا جہاں جزیرہ عرب انتہائی اخلاقی پستیوں میں گھرا ہوا تھا، عورتیں اپنے انسانی حقوق سے محروم، باپ کی میراث میں دوسری چیزوں کی طرح تقسیم ہو رہی تھیں، بے جان لکڑیاں اور پتھر بت کی شکل میں صنم کدوں میں مورد احترام قرار پا رہے تھے، جب کہ حوا کی بیٹیاں سر بازار بے جان اجسام کی طرح نیلام ہو رہی تھیں اخلاقی اقدار کو مسلسل پامال کیا جا رہا تھا، بیٹیاں زندہ درگور کی جا رہی تھیں، چراغ علم کا کوئی روشن کرنے والا نہیں تھا، خرافات اور جہالت کا بول، بالا تھا، دین و شریعت کا وجود قصۂ پارینا بن چکا تھا، مرکز توحید خانہ کعبہ بھی بت پرستی کا اڈا بن چکا تھا، برہنگی کی حالت میں طواف کی ادائیگی سنت ابراہیم کا کھلے عام مذاق اڑا رہی تھی کہ ایسے میں پروردگار عالم نے بشریت پر احسان کیا جو اپنے حبیب سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ کو مسیحائے عالم کے طور پر رحمت للعالمین بنا کر بھیجا.

عرب کے اس وقت کے ماحول کو قرآن مجید نے بھی اس طرح بیان کیا ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلاَّ تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلاَ تَقْتُلُوا اَوْلاَدَكُمْ مِنْ اِمْلاَقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلاَ تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلاَ تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلاَّ بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ[1] کہہ دیجئے کہ آؤ ان چیزوں کا ذکر کریں کہ جو خداوند عالم نے حرام کی ہیں ان میں سے یہ ہے کہ کسی کو اللہ کا شریک قرار نہ دو، اور والدین کے ساتھ نیکی کرو، اپنی اولاد کو تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کرو، کیونکہ تم کو بھی اور انہیں بھی ہم رزق دیتے ہیں، اور برے کاموں کے کھلے عام اور پوشیدہ طور پر بھی قریب بھی نہ جاؤ، اور کسی بھی انسان کو کہ جنہیں اللہ نے محترم بنایا ہے بلاوجہ کے قتل نہ کرو، سوائے اس کہ کے جب حق (الٰہی قانون) کا تقاضا ہو، یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کی خداوند عالم نے تمہیں تاکید کی ہے شاید کہ تمہیں سمجھ میں آجائے۔ اس آیت سے اس دور کے حالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مزید قرآن اس زمانہ کے اور وضاحت

[1] (سورہ انعام، آیت ۱۵۱)

اس طرح کرتا ہے : وَلاَتَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ لاَّ بِالَّتِي هِيَ حُسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ شُدَّهُ وَوُفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ لاَنُكَلِّفُ نَفْسًا لاَّ وُسْعَهَا وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى وَبِعَهْدِ اللهِ وَفُوا ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ [1] یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ، صرف اس صورت میں (جاسکتے ہو) کہ جب اس کی خدمت اور دیکھ بھال کا ارادہ ہو، تاکہ اس کی حفاظت ہو سکے، اور ناپ تول میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھو، ہم کسی کو بھی اس کی توانائی اور طاقت سے زیادہ ذمہ داریاں نہیں دیتے ہیں، جب کسی کے لئے فیصلہ کرنے اٹھو یا گواہی دینے کا ارادہ ہو تو صرف حق اور سچ بولو، چاہے مخالف (اور غلطی کرنے والے) تمہارے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، اور الٰہی عہد و پیمان کے وفادار رہو، یہ وہ چیزیں ہیں جن کی خداوند عالم نے تمہیں تاکید کی ہے تاکہ شاید اس سے نصیحت اور سبق لے

ان تاکیدات اور تفصیلی احکام میں خداوند عالم نے اس زمانہ کے حالات کو بھی بیان کر دیا ہے اور ان کے درمیان رائج خرافات اور غلط باتوں اور غلط چیزوں کا بھی تذکرہ ہو گیا ہے کہ وہ کیسے اور کس طرح زندگی گزار رہے تھے۔ ایسے دور و زمانہ میں سرکار کی آمد اللہ سبحانہ و تعالی کا ایک احسان عظیم ہے بشریت پر۔

ان باتوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس زمانہ کے حالات نہایت ہی ناگفتہ بہ تھے جہاں تمام تر خرافات اور جہالت کا عروج تھا اور اخلاقی و انسانی اقدار اور قدروں کی کوئی حیثیت اور وقعت نہ تھی، جہاں بے ایمانی کو ہنر اور ایمانداری کو کمزوری سمجھا جاتا تھا، طاقت ور اور مالدار صاحب حیثیت اور کمزور اور عام آدمی بے حیثیت ہوا کرتا تھا۔ ایسے دور میں اسلام کا پیغام انسانیت کے لئے ایک مسیحا کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں ہم مختصر طور پر ان اغراض و مقاصد کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو بعثت پیغمبر اکرم ﷺ کے صدقہ میں انسانیت کی بقا کے ضامن بنے۔

انسانی قدروں کی نئی زندگی

جہاں ایک طرف ہر طرح کی کثافت اور برائی سماج میں عام تھی وہیں حبیب خدا مجسمہ اخلاق اور نباض انسانیت بن کر زمانہ کا علاج کرنے کے لئے تشریف لائے، بے جان ہوتی ہوئی سسکتی بلکتی انسانی قدروں اور اخلاقی صفتوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں ابدی حیات دے دی۔ جس کے لئے مولائے کائنات کی مشہور حدیث ہے کہ آپ پیغمبر اکرم ﷺ کی شان میں فرماتے ہیں "طَبِيبٌ دَوَّارٌ بِطِبِّهِ" [2] ایسا طبیب ہے کہ جو گھر گھر جا کر سماج کے امراض کا علاج کر رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں خرافات کی جگہ حقیقت نے لے لی اور جنگ و خون ریزی کی جگہ امن و سکون نے لے لی، لوٹ مار اور دھوکہ بازی کی جگہ عدل و مساوات آگئی

---

[1] (سورہ انعام، آیت ۱۵۲)

[2] (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۷)

اور ظلم کی جگہ قربانی اور ایثار کا جذبہ کار فرما ہو گیا یہ ایک سماجی انقلاب تھا جو کہ حضور اکرم ﷺ کے وجود پر نور کی فضیلت سے سماج میں پھیلا اور ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ خرافات کا قلعہ قمع ہو گیا اور الٰہی اور اسلامی قدریں دوبارہ بحال ہو گئیں۔

آنحضرت ﷺ کی پوری کوشش تھی کہ خرافات کا خاتمہ ہو جائے اور مکمل طور سے الٰہی قانون کا نفاذ ہو جائے اور سماج ایک مکمل اسلامی سماج ہو جائے اس لئے آپ اپنے اصحاب کو بھی تاکید فرماتے تھے کہ زمانۂ جاہلیت کی غلط رسموں کو ختم کرنے کی پوری کوشش کرو اور اسلامی نظام کے نفاذ کو حتمی بناؤ۔ اور الٰہی سنت اور اسلامی رواج کو بڑھاوا دو یہاں تک کہ آپ نے اپنے آخری حج کے پیغام میں کھلے عام اور ببانگ دہل یہ اعلان فرمایا: "الاَ كُلُّ شَيئٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمِي مَوضُوع"[1] یہ جان لو کہ زمانۂ جاہلیت کی تمام باطل اور غلط رسم و رواج کو اپنے پیروں کے نیچے رکھتے ہوئے انہیں باطل قرار دیتا ہوں۔

تزکیہ و تربیت

انبیاء الٰہی کی بعثت کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد باصلاحیت اور زندہ ضمیر لوگوں کا تزکیہ اور تربیت ہے، سب اس لئے اس کا حصہ نہیں بن سکتے کہ انہوں نے بقول قرآن خود کو گونگا، اندھا اور بہرا بنالیا ہے اور حقیقت جاننے کے باوجود اسے قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ انبیاء الٰہی کی یہی کوشش رہتی ہے کہ ایسے زندہ دل اور نرم خو انسانوں کی تربیت کریں اور ان کو کمال انسانی تک پہنچائیں اور انہیں اخلاقی اور انسانی قدروں کی معراج تک لے جائیں اور جو مقصد خلقت ہے وہاں تک انہیں پہنچائیں جن میں خاطر خواہ کامیابی بھی ملتی ہے اور ایسے لوگ مہیا ہو بھی جاتے ہیں ورنہ بعثت کا مقصد ہی ادھورا رہ جائے گا۔ صدر اسلام میں سلمان، ابوذر، مقداد، عمار اس کی زندہ مثالیں ہیں جو پیغمبر اکرم ﷺ کے سچے اور پکے شاگرد بنے اور اس معنوی مقام تک پہنچے جہاں تک انسانوں کی رسائی ممکن ہے۔ بعثت کے خاص مقاصد کو قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے: لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ نَفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلاَلٍ مُبِينٍ)[2] خداوند عالم نے مومنین پر احسان کیا کہ ان میں سے ایک پیغمبر کو مبعوث کیا جو آیات کی تلاوت کرے نفسوں کو پاک کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اگرچہ تم سب اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں غرق تھے۔

اسی طرح سورہ جمعہ میں بھی اسی مفہوم کی آیت میں اشارہ ہوتا ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ[3] یہاں تھوڑے سے الفاظ مختلف ہیں لیکن بات وہی ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی جس نے مکہ والوں میں سے ایک کو رسول بنایا تاکہ

---

[1] (سیرۃ ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک بن ہشام حمیری، دار القلم، بیروت، ج ۴، ص ۲۵۰)

[2] سورہ آل عمران، آیت ۱۶۴

[3] سورہ جمعہ، آیت ۲

آیات کی تلاوت کرے نفوس کو پاک کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اگرچہ تم سب اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں غرق تھے۔ ان دونوں آیتوں میں صاف طور سے نبی اکرم کی بعثت کے مقاصد کو بیان کیا گیا ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ نے انہی اصول و ضوابط پر عمل کرتے ہوئے ایک اسلامی معاشرہ اور سماج تشکیل دینے کی کوشش کی اور مسلسل لوگوں کی ہدایت اور ان کی تربیت میں سرگرم رہے جس سے اسلام پورے خطہ عرب میں پھیل گیا اور ہر ستم دیدہ دائرہ اسلام میں آنے لگا اور یہاں اسے وہ سکون قلب میسر ہوا جس کا وہ متمنی تھا۔

مقام بندگی تک رسائی

قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق انسان کی خلقت کا مقصد سوائے خداوند عالم کی عبادت اور بندگی کے کچھ بھی نہیں ہے اسی خاص مقصد تک رسائی کو یقینی بنانا نبیوں کا کام تھا، اور پیغمبر اکرم ﷺ بھی اسی مقصد کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تھے۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے بندے کو اپنے کمال تک پہنچنے کا اور اپنے مقصد خلقت کو حاصل کرنے کا پیغمبر اکرم ﷺ نے اس مقصد کو اپنے سب سے اہم مقصد قرار دیتے ہوئے لوگوں کو اس جانب بلایا اور قرآن کے صاف اعلان نے اس پر مہر تائید ثبت کر دی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُونِ**[1] میں نے جناتوں اور انسانوں کو نہیں خلق کیا سوائے اس کے کہ میری عبادت کریں۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالی نے کھلے عام یہ بات رکھ دی کہ انسانوں اور جناتوں کا مقصد خلقت اللہ کی عبادت ہے بس۔ اسی کے ساتھ رسالت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے نبی کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کو راہ سعادت تک لے کر آئیں، انہیں سیدھا راستہ دکھائیں، اور انہیں عبودیت کے کمال اور بندگی کے راستہ کی نشاندہی کریں کیوں کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد اس وجہ سے دین سے دور ہو جاتی ہے کہ اسے صحیح راستہ کا پتہ ہی نہیں چلتا ہے لہٰذا ایسے سادہ لوح اور نیک لوگوں کو صحیح راستہ پر لانا بھی ضروری ہے اور وہ آمادہ اور تیار بھی ہوتے ہیں بس کسی راہ نما کے متلاشی ہو تے ہیں، اسی لئے پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے ابتدائی پیغام میں عالم انسانیت کو یہی راستہ صاف طور سے دکھاتے ہوئے آپؐ اس طرح فرماتے ہیں "**قُولُوا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تُفْلِحُوا**"[2] اے لوگوں تمام باطل خداؤں کا انکار کرتے ہوئے اللہ کا اقرار کرو اسے مانو اور کامیاب ہو جاؤ۔ یہی وہ راستہ تھا کہ جو عالم ممکنات کے لئے اہم اور ضروری تھا جس کا ماننا عین بندگی ہے۔

اتحاد کو مضبوط کرنا

نبوت ہی ایک ایسا مضبوط ذریعہ ہے جو انسانوں کو ایک مرکز پر متحد کر سکتا ہے اور جس کی کوشش تمام نبیوں نے اپنی پوری مدت حیات میں کی اور جو بھی نبیوں کی تبلیغ کے نتیجہ میں ان سے ملحق ہوا اسے اتحاد اور یکجہتی کا پیغام ملا یہ الگ بات ہے کہ بعد میں

---

[1] (ذاریات، آیت ۵۶)

[2] (بحار الانوار، علامہ محمد باقر مجلسی، نشر الوفا، بیتور ۱۴۰۴ھ، ج ۱۸، ص ۲۰۲)

دوسرے عوامل نے انہیں پھر سے منتشر کر دیا اور ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کے بنی کے بعد مختلف سیاسی، دنیوی اور ذاتی مفادات کی وجہ سے وہ اہم مقصد لوگوں سے فراموش ہوتا رہا۔ تمام لوگوں کو خداوند عالم نے ایک ہی درجہ میں اور ایک ہی نوعیت کی زندگی دے کر خلق کیا ہے۔ اگر تمام انسان ہر طرح کی ضد ہٹ دھرمی اور لالچ و خود غرضی کو بالا طاق رکھ کر الٰہی نمائندوں کی باتوں پر توجہ دیتے ہوئے پرچم توحید کے گرد جمع ہو جائیں اور اپنے تمام مفادات مقاصد پیچھے چھوڑ دیں تو سب کلمہ توحید کی طرح توحید کلمہ کے عنوان سے ایک ہو جائیں اور تمام لوگ ہم آواز ہو سکیں گے جس کی طرف قرآن مجید نے یوں اشارہ کیا ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ[1] ابتداء میں لوگ ایک ہی امت تھے (پھر مختلف وجوہات کی بیاد پر ان میں اختلافات وجود میں آگئے) پھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے نبیوں کا سلسلہ شروع کیا جو لوگوں کو بشارت دیں اور انہیں ڈرائیں اور ان (نبیوں) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں نازل کیں تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کے درمیان ان ہی کتابوں سے فیصلہ کریں۔ اس آیت کے مطابق انبیاء کی رسالت کا ایک اور اہم مقصد لوگوں کے درمیان ہونے والے اختلافات کا خاتمہ ہے۔ جو جہالت ، غفلت، لاعلمی اور مختلف وجوہات کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔

فیضان الٰہی کا ذریعہ

نبیوں کے ہی وجود مقدس کے صدقہ میں الٰہی فیض و برکات امت اور قوموں تک پہنچتی ہیں اور آپ کے وجود پر نور سے ہی قوموں میں ترقی اور دینی بیداری وجود میں آتی ہے اور ضلالت و گمراہی سے عوام کو نجات ملتی ہے

اخلاقی فضائل و کمالات

انسانی اخلاقی فضائل اور کمالات یہ شروع سے ہی الٰہی اور دینی زندگی کا حصہ رہا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے کہ جس کی جھلک تمام انبیاء کرام کی زندگی میں عیاں ہے، اور رسالت کے مقاصد میں سے ایک ہے کہ تمام انسانوں کو اخلاق حسنہ اور حسن خلق کی طرف لایا جائے کیونکہ انسان کے کردار کی ایک اہم چیز یہی اخلاق اور حسن معاشرت ہے وہ انسان معاشرہ میں کبھی بھی اچھا نہیں ہو سکتا جس کا اخلاق اچھا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے خود پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد اسی اخلاق کی تکمیل کو قرار دیا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں: "اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ"[2] میں اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔

آپ ﷺ خود اخلاق حسنہ کو مجسمہ تھے جس کی مثال پوری تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ اپنا ہو یا پرایا ہر ایک آپ کے حسن سلوک کا قائل تھا اور اسی وجہ سے آپ کی شخصیت بھی سب کے لئے بے حد محترم تھی۔

---

[1] (سورہ بقرہ، آیت ۲۱۳)

[2] (مستدرک الوسائل، محدث نوری، موسسہ آل البیت، ۱۴۰۸، قم، ج ۱۱، ص ۱۸۷)

عدل و انصاف

سماج اور معاشرہ کی بقا اور ترقی کے لئے ایک عنصر عدالت و انصاف کا قیام اور رائج ہونا ہے، جس معاشرہ میں عدل و انصاف کا رواج نہیں ہوگا اس میں کوئی بھی کسی پر بھروسہ نہیں کرے گا اور نہ ہی معاشرہ آگے بڑھے گا۔ اور اس کے لئے صرف بڑی بڑی باتوں میں خیال رکھنا کافی نہیں ہے بلکہ چھوٹی سے چھوٹی چیز میں بھی عدل و انصاف کا لحاظ نہایت ضروری ہے اسی سے اعتبار بنے گا خاص کر جو معاشرہ میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں، سماج میں رہبری کے خواہش مند ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان کا ہر عمل عدل و انصاف کے ساتھ ہو، اور یہ اتنی اہم چیز ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ کو اللہ سبحانہ و تعالی نے خاص حکم دیا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ[1] کہدیجئے کہ میرے رب نے مجھے عدالت قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تاکید فرمارہا ہے کہ میرے مجسمہ اخلاق اور عدالت، پیغمبر ﷺ، میں آپ کو بھی تاکید کر رہا ہوں تاکہ اس کی اہمیت لوگوں پر واضح ہو جائے جس سے عدالت و انصاف کا عام رواج ہو جائے اور لوگ اپنی ہر بڑی چھوٹی باتوں اور اپنے ہر کام میں عدالت کا خیال رکھیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ یہاں تک عدالت کا خیال رکھتے تھے کہ جب وہ بزم میں اصحاب پر نظر ڈالتے تھے تو اس میں بھی عدالت سے کام لیتے اور سب پر برابر نظر کرتے تھے صرف کسی ایک طرف نہیں دیکھتے تھے۔

اس بارے میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "**کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ یُقَسِّمُ لَحَظَاتَہ بَیْنَ اَصْحَابِہِ فَیَنْظُرُ اِلَی ذَا وَ یَنْظِرُ اَلٰی ذَا بِالسَّوِیَّۃِ**"۔[2] پیغمبر اکرم ﷺ جب بھی اپنے اصحاب کے مجمع پر نظر ڈالتے تھے تو اپنی نگاہوں کو برابر تقسیم کرتے تھے اور سب پر برابر نظر ڈالتے تھے۔

آخر کلام

پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت انسانیت پر رب کائنات کا عظیم احسان ہے جس نے انسانوں کو کمالات تک رسائی کے لئے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ کو اس وقت مسیحائے عالم بنا کر بھیجا جس وقت بشریت کو آپ ﷺ کی اشد ضرورت تھی، اور ایسے دور میں بھیجا جس میں برائیاں اپنے عروج پر تھیں لیکن اس نمائندہ الٰہی نے پتھر کھانے اور کوڑے ڈالے جانے کے باوجود انسانیت کو خرافات کے کوڑے دان سے نکال کر مالک حقیقی کی بارگاہ میں مصلائے عبادت پر سجدہ ریز کروادیا۔ جہاں ہر طرف افراتفری کا ماحول تھا وہاں دین الٰہی کی دم توڑ چکی بنیادوں کو دوبارہ زندہ کیا کعبہ کو دوبارہ قبلہ عالم بنایا اور عرب کے انسان نما درندوں کو شرافت کا مجسمہ بنا کر شیطان کی غلامی سے نکال کر اللہ کا بندہ بنادیا

---

[1] (سورہ اعراف، آیت ۲۹)

[2] (بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۲۶۰)

آیہ «عفا اللہ عنک».. اور عصمتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

محمد تقی رضا

عصمت انبیاء مسلمانوں کے درمیان ایک مسلم امر ہے خاص طور پر مذہب حقہ شیعہ کے نزدیک لہذا اگر کہیں پر کوئی بات روایات میں بظاہر ایسی لگتی ہے کہ جو ان کی شان عصمت کے بر خلاف ہو تو علماء شیعہ اس کو گناہ کے بجائے ''ترکِ اولی'' سے تعبیر کرتے ہیں کیوں کہ معصوم حکم خداوندی کی مخالفت نہیں کر سکتا جس کی بنا پر ان کی طرف گناہ کی نسبت دی جائے مثلاداستان حضرت آدم علیہ السلام میں انھوں نے درخت کے پاس نہ جاکر حکم الہی اشثال کیا لیکن درخت کا پھل کھا کر ان سے ترکِ اولی صادر ہوا جب کہ مناسب یہ تھا کہ وہ پروردگار سے سوال کرتے خداوندا درخت کے نزدیک جانا منع ہے یا اس کے پھل کھانا بھی منع ہے لیکن آدم علیہ السلام نے سوال نہیں کیا اور پھل کھالیا جس کی بنا پر ان سے ترکِ اولی صادر ہوا یعنی جس کام کو نہ کرنا بہتر تھا وہ کر ڈالا لیکن یہ گناہ نہیں ہے جیسے بغیر پیاس کے آپ پانی لیں یہ گناہ نہیں لیکن بغیر پیاس کے پانی پینا اور بغیر بھوک کے کھانا کھانا مناسب نہیں ہے۔ اور ہمارے نبی سے ایسے امور کا امکان بھی محال ہے چہ جائیکہ ان سے غلطی اور خدا کی نافرمانی سرزد ہو جس کی بنا پر خداوند عالم فرمائے: خدا نے آپ سے در گزر کیا آپ نے کیوں انہیں {مدینے میں رہ جانے کی} اجازت دے دی "عفا اللہ عنك لم اذنت لهم "(سورہ توبہ/آیۃ ۴۳) جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غلطی نہیں تو در گزر کیسا؟

اب سوال یہ ہے کہ جب مذہب شیعہ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ''ترکِ اولی'' کا بھی امکان نہیں تو پھر خداوند متعال نے اس لہجہ میں آپؐ سے کیوں بات کی؟ اس سوال کے جواب کو سمجھنے کے لئے آیت کے شان نزول پر توجہ دینا ضروری ہے تاکہ بات مکمل طور پر سمجھ میں آسکے آیت کا مفہوم کیا ہے اور کس سے خطاب ہے۔

اس آیت کا نزول اس وقت ہوا کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آٹھ ہجری میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنگ طائف سے مدینہ واپس آرہے تھے کہ اسی دوران روم نے اپنے دشمن ایران کو شکست دے کر اس پر غلبہ حاصل کیا اور پھر حجاز کا رخ کیا تاکہ اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے کیونکہ وہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ اسلام روز بروز اپنی جڑ مضبوط کرتا جا رہا ہے جو بعد میں روم کے باشندوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے کیونکہ اگر روم کے رہنے والے مسلمان بن جاتے تو پھر مسیحی وہاں پر حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ روم عنقریب اسلامی حکومت پر حملہ کرنے والا ہے، لہذا خداوند متعال کی طرف سے جہاد کا حکم صادر ہوا لیکن ایک

طرف مسلمان جنگ سے خستہ ہو کر مدینہ واپس آچکے تھے،ان میں اکثر کا پیشہ باغبانی و باغداری تھا،اتفاق سے خرمے چننے کا وقت بھی آپہنچا تھا،اس کے علاوہ مسلمان کافی دنوں سے اپنے اہل و عیال سے بھی دور تھے جن سے کافی دنوں کے بعد ملاقات ہو رہی تھی،یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی سستی کا سبب بن رہی تھیں کہ وہ جہاد جیسے اہم امرِ الٰہی میں ٹال مٹول اور سستی کا اظہار کر رہے تھے۔

دوسری طرف رومیوں سے لڑنے کے لیے، شام کے گرم و سوزان بیابانوں کو طے کر کے کافی دور جانا ان کی سرپیچی کا بہترین بہانہ بن رہا تھا کہ اسی دوران یہ آیت نازل ہوئی :يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ۔ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔[1]

ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ راہ خدا میں جہاد کے لئے نکلو تو تم زمین سے چپک کر رہ گئے کیا تم آخرت کے بدلے زندگانی دنیا سے راضی ہو گئے ہو؟ یاد رکھو کہ آخرت میں اس متاع زندگانی دنیا کی حقیقت بہت قلیل ہے۔ اگر تم راہ خدا میں نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور تمہارے بدلے دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہو اور خدا ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

مومنین میں اس آیۃ شریفۃ کو سنے کے بعد جذبہ ایجاد ہوا اور جہاد کے لیے تیار ہو گئے،شام کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کیا لیکن کچھ منافق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذکورہ مختلف بے بنیاد بہانوں کی بنا پر شہر میں رکنے اور جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت طلب کرنے لگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ چاہے ان کو اجازت دیں یا اجازت نہ دیں کسی بھی حالت میں حاضر نہ ہونگے لہذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصلحت کے پیش نظر ان کو رکنے کی اجازت دے دی جس پر یہ آیت نازل ہوئی:"عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ"{پیغمبر!} خدا نے آپ سے درگزر کیا کہ آپ نے کیوں انہیں {رکنے کی} اجازت دے دی؟ تاکہ واضح ہو جائے ان میں کون سچّا ہے اور کون جھوٹا ہے۔

سپاہ اسلام جنگ کے لئے روانہ ہوتی ہے منافقین بغیر کسی عذر کے جہاد میں جانے سے گریز کرتے ہیں اور اطاعت نہ کرنے کی سزا سے بچنے کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدینہ میں رہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں،اگرچہ ان افراد کا شریک نہ ہونا ہی بہتر تھا کیونکہ خداوند متعال بعد کی آیات میں فرماتا ہے»:لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ

---

[1] سورہ توبہ//۳۸و۳۹

[2] سورۃ توبہ/آیۃ ۴۳

يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ» [11] اگر یہ تمہارے درمیان نکل بھی پڑتے تو تمہاری درمیان شر و فساد کے علاوہ کچھ اضافہ نہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے اور تم میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی سننے والے تھے اور اللہ ظالمین کو خوب جاننے والا ہے۔

اس بنا پر ان کا جانا، سپاہ اسلام کے لئے نقصان کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ وہ فتنہ گری کے سوا کچھ نہ کرتے اور لشکر میں بھی ایسے سادہ افراد موجود تھے جو جلدی بہکاے میں آجاتے اس بنا پر اگر منافقین جنگ میں آتے تو مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کر دیتے، دشمنوں کے لیے جاسوسی کرتے اور پیغمبر ﷺ کے خلاف پروپگنڈا کرتے، کل ملا کر ان کا جانا مسلمانوں کے خلاف اور دشمنوں کے حق میں ہوتا لہذا ان کا شریک نہ ہونا ہی بہتر تھا۔ لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب منافقین کا نہ جانا ہی بہتر تھا تو پھر ان کی مذمت کیوں کی جارہی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسلام کو سب سے زیادہ مجاہدین کی ضرورت ہے تو یہ لوگ اپنی جان کو اسلام پر فدا کرنے سے گریز کر رہے ہیں، اس لیے ان لوگوں کی مذمت کی جارہی ہے

پیغمبر ﷺ نے ان کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دینے کے بعد مولائے کائنات حضرت امیر المومنین (علیہ الصلوۃ والسلام) کو حکم دیا کہ وہ مدینے میں رہیں، اور جنگ میں آپؐ کے ہمراہ نہ آئیں تاکہ مدینہ میں رہ کر منافقین کی حرکات اور سکنات پر توجہ رکھیں اور مدینہ کو ان کے احتمالی خطرات سے بچائیں تاکہ مدینہ میں امنیت باقی رہے۔ اسی مقام پر آپؐ ﷺ نے حضرت علیؑ کی شان میں "حدیث منزلت" بیان فرمائی: "أنت منّی بمنزلة هارون من موسی الّا أنه لا نبی بعدی" آپ کا مقام میرے نزدیک ایسا ہی ہے جیسا موسی کے نزدیک ہارون کا تھا مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

مولائے کائنات امیر المومنین علیہ السلام کے مدینہ میں رکنے سے منافقین کا سارا پروگرام ناکام ہوگیا۔ دوسری جانب جنگ تبوک مجاہدوں کے گھوڑے دوڑائے بغیر اور تلوار چلائے بغیر ختم ہوگئی اور روم والے ڈر کے مارے اپنے وطن واپس چلے گئے اور لشکر اسلام فتح کے بعد تبوک سے مدینہ واپس آرہا تھا تو ایسے میں کچھ منافقین نے رات کی تاریکی میں پیغمبر ﷺ کو قتل کرنے کی پلانگ کی، لیکن خداوند متعال کے فضل و کرم سے وہ لوگ اپنے ناپاک ارادہ میں ناکام ہوگئے اور پیغمبر ﷺ صحیح و سلامت مدینے پہنچ گئے۔ یہ سورہ توبہ کی مذکورہ آیت کا معنی و مفہوم تھا. اسی دوران آیۃ «عفا الله عنك لم اذنت لهم ...» (سورہ توبہ/ آیۃ ۴۳) کا نزول ہوتا ہے جو ہماری مورد بحث ہے جس میں چند باتیں

غور طلب ہیں مثلا یہ کہ کیا (نعوذ باللہ) پیغمبر اکرم ﷺ کا منافقین کو مدینہ میں رک جانے کی اجازت دینا صحیح نہ تھا کیونکہ اگر آپؐ ان کو اجازت نہیں بھی دیتے تو بھی وہ جنگ میں شریک نہ ہوتے اور اس طرح ان کے چہرے سے نفاق کا نقاب جلدی ہٹ جاتا اور ان

[11] سورہ توبہ/ آیۃ ۴۷

کا اصلی چہرہ سامنے آجاتا لیکن پیغمبر ﷺ کے اجازت دینے کی بنا پر وہ پہچانے نہیں گئے، کیا اس لئے خدا نے فرمایا کہ آپ نے ان کو رکنے کی اجازت دے کر صحیح نہیں کیا، لیکن کوئی بات نہیں ہم نے آپ کی اس تقصیر کو معاف کر دیا، کیا پیغمبر کا ان کو رکنے کے لیے اجازت دینا خداوند کے حکم جہاد کے خلاف تھا اور پیغمبر ﷺ نے خدا کی مرضی کے خلاف قدم اٹھایا؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ پیغمبر ﷺ کا اجازت دینا خداوند متعال کا اجازت دینا ہے جس کی بنا پر پیغمبر ﷺ نے صحیح کام کیا؟ اگر ایسا ہے تو پھر خداوند متعال کیوں فرمایا میں نے تمہیں معاف کیا؟ اور پھر کیوں پیغمبر ﷺ سے اجازت دینے کی علت کو پوچھتا ہے؟ کیا یہ آیت پیغمبر ﷺ کی معصیت یا کم از کم ان سے "ترک اولی" کے سرزد ہونے پر دلالت نہیں کرتی؟

ان سوالات کا جواب دینے کے لیے اس چیز کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے کہ کیا اس آیت (عَفَا اللّٰهُ عَنكَ ...) کا ترجمہ (اللہ نے تمہیں معاف کیا) یا (اللہ تمہیں معاف کرے) صحیح ہے یا نہیں؟ جبکہ خداوند متعال قرآن میں دوسری جگہ پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے: (وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی) پیغمبر ﷺ ہوا و ہوس اور اپنی مرضی سے نہیں بولتے بلکہ جو بھی کہتے ہیں وہ "وحی الہی" ہوتا ہے۔ اس آیت سے سمجھ میں آتا ہے کہ پیغمبر ﷺ جو بھی بولتے ہیں وہ خداوند متعال کی وحی ہی کے مطابق بولتے ہیں۔

جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اگر پیغمبر ﷺ منافقین کو اجازت دے رہے ہیں تو وہ خداوند متعال ہی کی اجازت ہے اس بنا پر معنی ہی نہیں رکھتا کہ آیت کا معنی یہ ہو کہ اللہ نے تمہیں معاف کیا یا تم سے درگزر کیا کیونکہ جب حضور ﷺ کا اجازت دینا خدا کا اجازت دینا ہو تو آپؐ سے غلطی ہی کہاں ہوئی جو خدا کہے ہم نے تک کو معاف کیا.

دوسری طرف پیغمبر ﷺ مسلمین کے سرپرست اور ولی امر ہیں جن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جسے چاہے اذن دیں، یہ الگ بات ہے کہ خود منافقین کا اذن مانگنا صحیح نہیں ہے لہذا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ عَفَا اللّٰهُ عَنكَ ...) کا معنی خدا نے تم سے درگزر کیا ہو کیوں کہ اس سے خود خداوند عالم کی ذات اقدس پر حرف آتا ہے کہ ایک طرف اپنے حبیب کی گفتار کی ضمانت لیتا ہے کہ اس کی بات میری بات ہے دوسری طرف ان کے بولنے پر کہتا ہے کیوں ایسا کہا؟

ایک اور چیز جو اس بات پر قرینہ ہو سکتی ہے کہ اس آیت کا معنی "اللہ نے تم کو معاف کیا" نہیں ہے وہ خدا رحمن اور رحیم ہے، جس کی بنا پر اس بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ معاف کرنے کے بعد سوال کرے کہ کیوں ایسا کیا؟ خداوند متعال کی بات تو بہت دور اس کریم بندے بھی ایسا نہیں کرتے جبکہ آیۃ سے ظاہر ہے کہ خدا معاف (عفا اللہ عنک) کرنے کے بعد کہہ رہا ہے (لما اذنت لہم) تم نے ان کو کیوں اجازت دی کیونکہ خداوند متعال کی رحمانیت اور مہربانی سے دور ہے کہ وہ پہلے اپنے پیارے حبیب کو معاف کرے اور پھر اجازت دینے پر سرزنش اور توبیخ کرے اس کا مطلب یہ ہے کہ (عفا اللہ عنک) معاف کرنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ کسی اور معنی میں ہے اب سوال یہ ہے کہ پھر کس معنی میں ہے؟

جب ہم ادبیات عرب میں غور کرتے ہیں اور اس قسم کے جملوں کے استعمال کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ جملہ لطف و مہربانی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے

یہ جملہ ظاہری طور پر ماضوی ہونے کے باوجود انشائی اور دعائی ہے اور اس جملے کا دعائی ہونے کا قرینہ اس کے استعمال کی شہرت ہے۔ جیسے (رحم الله والديك) استعمال ہوتا ہے یا مثلا اردو میں ایسے کہا جاتا ہے کہ خداوند متعال آپ کے والدین کی مغفرت فرمائے اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خداوند متعال نے (عفا الله عنك) اظہار محبت کے لیے فرمایا ہے نہ کسی گناہ یا خطا کو معاف کرنے کے لیے کیونکہ یہاں کوئی گناہ اور خطا ہی سرزد نہیں ہوئی ہے۔

لیکن ایک سوال ابھی باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ پھر خداوند متعال پیغمبر ﷺ سے کیوں کہہ رہا ہے کہ (لم اذنت لہم)؟ مامون عباسی نے یہی سوال امام رضا علیہ الصلاۃ والسلام سے پوچھا تھا تو آپؑ نے فرمایا تھا: **هذا ممّا نزل بإياك أعني واسمعي يا جارة خاطب الله عز وجل بذلك نبيه وارادبه امته.** یہ ان چیزوں میں سے ہے جہاں خداوند متعال نے پیغمبر ﷺ کو خطاب کر کے دوسرے افراد مراد لئے ہیں یعنی حضور ﷺ کے ذریعہ ان کی امت کو خطاب کیا ہے۔ اس فن کو علم بلاغت میں ''تعریض'' کہتے ہیں البتہ تعریض کے لیے غرض ہونا چاہیے۔

(لم اذنت لہم) میں کونسی غرض ہے؟ اس میں دو غرض ہو سکتی ہیں :

۱) خداوند متعال منافقین کو اس لائق بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو خطاب قرار دے اور اسی لیے پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب قرار دے کر منافقین کی مذمت کر رہا ہے۔

۲) اگر خداوند متعال صرف منافقین کو خطاب قرار دیتا تو ممکن تھا کہ یہ سمجھ میں آئے کہ یہ مذمت صرف اس زمانے کے منافقین کے لئے ہے، لیکن خداوند متعال نے پیغمبر ﷺ کو خطاب کیا کیونکہ آپؐ کی نبوت ابدی ہے جس سے خداوند یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ مذمت ہر اس شخص کے لیے ہے جو حکم جہاد آنے کے بعد جبکہ لشکر اسلام کو مجاہدین کی ضرورت ہو تب بھی اپنی جان بچانے کی خاطر ولی امر سے جہاد نہ کرنے کی اجازت لیتا ہے۔ لہذا یہ آیت قیامت تک آنے والے ایسے پست افراد کی ذلت و خواری پر دلالت کرتی ہے۔

اب یہاں سے سمجھ میں آتا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے جو اجازت دی تھی وہ در حقیقت خداوند متعال کی اجازت تھی جس میں دوسری مصلحتیں پائی جاتی تھیں کہ جس کی وجہ سے وہ چاہتے تھے منافقین کا اصلی چہرہ جلدی نمایاں نہ ہو۔ البتہ منافقین کا جلدی رسوا اور خوار ہونا ملاک اور معیار نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے پیغمبر ﷺ پر کوئی حرف آتا ہو۔ خداوند متعال اس اجازت کے بعد پیغمبر ﷺ سے اظہار محبت اور مہربانی کرتا ہے اور اس کے بعد آنے والی مذمت منافقین کے لیے ہے پیغمبر کے لیے نہیں ہے۔

محسن اسلام (حضرت ابو طالبؑ)

(علامہ ذیشان حیدر جوادی کلیم الہ آبادی)

حیف اس کو بھی سمجھنے لگی دنیا کافر
جس کے رشتوں میں نہیں کوئی بھی رشتہ کافر

جس کو بھی چاہے بنا دیتا ہے مُلّا کافر
سچ ہے کافر کو نظر آتی ہے دنیا کافر

بت پرستوں کو مسلمان سمجھنے والے
خاک سمجھیں گے مسلمان ہے کیا، کیا کافر

کفر کی بحث نہ چھیڑو تو غنیمت ہے یہی
ورنہ بتلائیں گے ہم کون ہے کیسا کافر

کون جانے کہ پیمبر کو ضرورت کیا تھی
عقد مسلم کا ہو، پڑھنے لگے صیغہ کافر

جس کی گودی کا پلا بانی اسلام بنے
وہ بھی کافر ہے تو ہے سارا زمانہ کافر

اس کے پوتے ہیں زمانے میں حسین اور حسن
پوتے سردار جناں اور ہے دادا کافر؟

اک علی نفس نبی، ایک علی ہے سجاد
اس کا بیٹا کوئی کافر ہے نہ پوتا کافر

باقر علم خلف جعفر صادق وارث
کب زمانے میں کوئی ہوتا ہے سچا کافر

اس کے اک لال کو کہتا ہے زمانہ کاظم
وہ ہے موسیٰ تو نہیں ہوتا ہے موسیٰ کافر

اُس کے ایماں کی علامت ہے رضا کا دربار
جہاں آجائے تو کر لیتا ہے سجدہ کافر

اس کے کردار کا اعلان ہے تقوائے تقی
اور نہیں ہوتا کوئی صاحب تقویٰ کافر

نفس ہے اُس کا نقی اور سراپا ہے حسن
کون اس نسل کے مورث کو کہے گا کافر

اس کا فرزند جب آئے گا الٹ کر پردہ
پھر زمانے میں کوئی رہ نہ سکے گا کافر

سرِ دربار یہ اعلان کیا زینب نے
ابو طالب نہیں، ہے آلِ امیہ کافر

اُس کا پوتا تھا علمدار شہ دیں عباس
پوتا ہو جس کا علمدار وہ کیسا کافر

اُس کے اکبر کی اذاں آج تلک گونجتی ہے
کیا کوئی داعی توحید بھی ہوگا کافر

کلمہ پڑھنے سے مسلماں نہیں ہوتا کوئی
کرتے ہیں کتنے ہی اسلام کا دعویٰ کافر

ابو سفیان کے بارے میں زباں کھلتی نہیں
اس کو کچھ کہتے نہیں جو تھا سراپا کافر

"لعمرک انہ لفی ضلالتہم" کی آواز سنا،
قوم کا ذکر ہو کیا جب ہے خلیفہ کافر

طور مدحت پہ ہے مصروفِ مناجات کلیم
دل لرزتا ہے کہ ہو جائے نہ دنیا کافر

مولا علی علیہ السلام کی نظر میں دشمن کی شناخت اور اس سے مقابلہ

زائر عباس

دنیا میں آنے والا ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ دن پر دن کامیابی کی راہوں کو طے کرتا ہوا ترقی کی اس آخری منزل تک پہونچ جائے جسے نقطہ کمال کہا جاتا ہے، اور انسان اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے دعا کے ساتھ ساتھ حتی المقدور کوشش بھی کرتا ہے۔ وہ لوگ جو کوشش کرتے ہیں ان میں سے کچھ لوگ اپنی منزل مقصود کو پا لیتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگوں کی رسائی اس مقام تک نہیں ہو پاتی، اور کچھ لوگ کامیابی کی دہلیز پر پہنچ کر بھی ناکامی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ افراد کون ہیں جو محنت کرنے کے بعد بھی کامیابی حاصل نہیں کر پاتے یا وہ افراد جو ترقی کرنے کے بعد پھر سے ناکامی کی دہلیز پر آکھڑے ہوتے ہیں؟

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں ملے گا کہ وہ قومیں، وہ سماج، وہ سوسائٹی، حتی وہ افراد جو ترقی کی بلندیوں کو چھو رہے تھے وہ نابودی کے اندھیروں میں گم ہو گئے، یہ افراد وہ تھے جو اپنے دشمن سے ناواقف اور اپنے مخالفین سے ناآشنا تھے۔ جہاں انکی نابودی کے بہت سے دلائل و بربادی کی مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں وہیں دشمن شناسی سے ناواقفیت اور ان سے مقابلہ و مبارزہ سے ناآگاہی بھی ایک مہم وجہ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں انسان کی کامیابی اور ترقی، اسکی محنت و مشقت اور اس کی کوشش پر منحصر ہے وہیں کامیابی کی بلندیوں پر ٹھہرے رہنے کے لئے دشمن شناسی بھی ایک عظیم رکن ہے۔ جہاں ترقی کے میدان میں کوشش اور جد و جہد انسان کے لیے ایک اسلحہ کا کام کرتی ہے وہیں دشمن شناسی سپر کا کام کرتی ہے جو ناکامی کی طرف سے ہونے والے حملوں کو دفاع کرتی ہے اور انسان کو بربادی سے بچاتی ہے۔ یعنی اگر دشمن شناسی نہیں ہو گی تو کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ترقی کے سفر کو جاری رکھے۔ بس جس طرح انسان کی زندگی کے لیے مناسب غذا، آب و ہوا... ضروری ہے اسی طرح کامیاب زندگی کے لیے یعنی ترقی یافتہ زندگی کے لیے دشمن شناسی ضروری ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دشمن ہے کون؟ اگر دیکھا جائے تو دشمنی کا دائرہ وسیع ہے جیسے جسم کا دشمن جراثیم، بیکٹیریا، وائرس، روح کا دشمن کفر، شرک، نفاق، عقل کی دشمن ہوا و ہوس یعنی شہوت ہے[1]۔ اب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی نگاہ میں دشمن کی شناخت کیا ہے؟ تو آپ کے ارشادات اور فرامین سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی دو قسمیں ہیں: ایک آشکار اور کھلا دشمن اور

[1] امام علی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ: العقل عدو الھوی ہوائے نفس اور شہوت عقل کی دشمن ہے

دوسرا پنہاں اور چھپا ہوا دشمن، اور دونوں دشمنوں کی خصوصیات کے بارہ میں امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ: ان میں سے خطرناک ترین دشمن وہ ہے جو اپنی دشمنی کو پوشیدہ رکھے اور اپنی دشمنی کو آشکار کرنے والا دشمن اپنی دشمنی کو پنہاں رکھنے والے دشمن سے کم خطرناک ہے. اور فرمایا: "أوهَنُ الأعداءِ كَيدا مَن أظهَرَ عدَاوتَهُ" کمزور ترین دشمن وہ ہے جو اپنی دشمنی کو آشکار کر دیتا ہے[1]. اور ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ: "مَن أظهَرَ عَداوَتَهُ قَلَّ كَيدُهُ" جو اپنی دشمنی کا اظہار کر دے اسکا مکر و فریب اور سازش کم ہوتی ہے[2].

یعنی خطرناک ترین دشمن وہ ہوتے ہیں جو اپنی دشمنی کو چھپائے رکھتے ہیں. امیر المومنین علیہ السلام ایسے لوگوں کے لیے فرماتے ہیں: "شَرُّ الْأَعْدَاءِ أَبْعَدُهُمْ غَوْرا وَ أَخْفَاهُمْ مَكِيدَة" یعنی بد ترین دشمن وہ ہیں جو مقابل کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں، اور ان کی چالیں زیادہ پوشیدہ ہوتی ہیں[3]. اسی طرح کا ایک قول اور ملتا ہے "أكبر الاعداء اخفاهم مكيدة" "بزرگترین دشمن وہ ہیں جو اپنے حیلہ اور سازشوں کو زیادہ چھپا کر رکھتے ہیں[4].

مولائے کائنات جناب مالک اشتر کو ایک نامہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ دشمن سے جنگ ناکر کے اسکی صلح کی پیشکش کو قبول کرنے میں کیا فوائد ہیں. وَ لَا تَدْفَعَنَّ صُلْحًا دَعَاكَ اِلَيْهِ عَدُوُّكَ وَ لِلّٰهِ فِيْهِ رِضًا، فَاِنَّ فِي الصُّلْحِ دَعَةً لِّجُنُوْدِكَ، وَ رَاحَةً مِّنْ هُمُوْمِكَ، وَ اَمْنًا لِّبِلَادِكَ، وَ لٰكِنِ الْحَذَرَ كُلَّ الْحَذَرِ مِنْ عَدُوِّكَ بَعْدَ صُلْحِهٖ، فَاِنَّ الْعَدُوَّ رُبَّمَا قَارَبَ لِيَتَغَفَّلَ، فَخُذْ بِالْحَزْمِ، وَ اتَّهِمْ فِيْ ذٰلِكَ حُسْنَ الظَّنِّ: اگر دشمن ایسی صلح کی تمہیں دعوت دے کہ جس میں اللہ کی رضا مندی ہو، تو اسے کبھی ٹھکرا نہ دینا۔ کیونکہ صلح میں تمہارے لشکر کیلئے آرام و راحت، خود تمہارے لئے فکروں سے نجات اور شہروں کیلئے امن کا سامان ہے۔ لیکن صلح کے بعد دشمن سے چوکنا اور خوب ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دشمن قرب حاصل کرتا ہے تاکہ تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھائے۔ لہٰذا احتیاط کو ملحوظ رکھو اور اس بارے میں حسن ظن سے کام نہ لو۔

مولائے کائنات جناب مالک اشتر کو اسی نامہ میں آگے نصیحت فرماتے ہیں کہ اگر دشمن سے کوئی معاہدہ کرو تو اپنے قول کی پابندی کرو: وَ اِنْ عَقَدْتَّ بَيْنَكَ وَ بَيْنَ عَدُوِّكَ عُقْدَةً، اَوْ اَلْبَسْتَهٗ مِنْكَ ذِمَّةً، فَحُطْ عَهْدَكَ بِالْوَفَآءِ، وَ ارْعَ ذِمَّتَكَ بِالْاَمَانَةِ، وَ اجْعَلْ نَفْسَكَ جُنَّةً دُوْنَ مَا اَعْطَيْتَ، فَاِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ فَرَآئِضِ اللّٰهِ شَيْءٌ النَّاسُ اَشَدُّ عَلَيْهِ اجْتِمَاعًا، مَعَ تَفَرُّقِ اَهْوَآئِهِمْ، وَ تَشَتُّتِ اٰرَآئِهِمْ، مِنْ تَعْظِيْمِ الْوَفَآءِ بِالْعُهُوْدِ، وَ قَدْ لَزِمَ ذٰلِكَ الْمُشْرِكُوْنَ

---

[1] غرر الحکم ۳۲۵۸

[2] غرر الحکم ۷۹۵۶

[3] عیون الحکم والمواعظ، جلد ۱ صفحہ ۲۹۵

[4] مستدرک نہج البلاغہ صفحہ ۱۵۷

[5] نہج البلاغہ نامہ ۵۳

فِيمَا بَيْنَهُمْ دُوْنَ الْمُسْلِمِيْنَ، لِمَا اسْتَوْبَلُوْا مِنْ عَوَاقِبِ الْغَدْرِ، فَلَا تَغْدِرَنَّ بِذِمَّتِكَ، وَ لَا تَخِيْسَنَّ بِعَهْدِكَ، وَ لَا تَخْتِلَنَّ عَدُوَّكَ، فَاِنَّهٗ لَا يَجْتَرِءُ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا جَاهِلٌ شَقِيٌّ. وَ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ وَ ذِمَّتَهٗ اَمْنًا اَفْضَاهُ بَيْنَ الْعِبَادِ بِرَحْمَتِهٖ، وَ حَرِيْمًا يَّسْكُنُوْنَ اِلٰى مَنَعَتِهٖ، وَ يَسْتَفِيْضُوْنَ اِلٰى جِوَارِهٖ، فَلَا اِدْغَالَ وَ لَا مُدَالَسَةَ وَلَا خِدَاعَ فِيْهِ.

اور اگر اپنے اور دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ کرو، یا اسے اپنے دامن میں پناہ دو، تو پھر عہد کی پابندی کرو، وعدہ کا لحاظ رکھو، اور اپنے قول و قرار کی حفاظت کیلئے اپنی جان کو سپر بنا دو۔ کیونکہ اللہ کے فرائض میں سے ایفائے عہد کی ایسی کوئی چیز نہیں کہ جس کی اہمیت پر دنیا اپنے الگ الگ نظریوں اور مختلف رایوں کے باوجود یکجہتی سے متفق ہو، اور مسلمانوں کے علاوہ مشرکوں تک نے اپنے درمیان معاہدوں کی پابندی کی ہے۔ اس لئے کہ عہد شکنی کے نتیجہ میں انہوں نے تباہیوں کا اندازہ کیا تھا۔ لہٰذا اپنے عہد و پیمان میں غداری اور قول و قرار میں بد عہدی نہ کرنا اور اپنے دشمن پر اچانک حملہ نہ کرنا، کیونکہ اللہ پر جرأت جاہل بد بخت کے علاوہ دوسرا نہیں کر سکتا، اور اللہ نے عہد و پیمان کی پابندی کو امن کا پیغام قرار دیا ہے کہ جسے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے، اور ایسی پناہ گاہ بنایا ہے کہ جس کے دامنِ حفاظت میں پناہ لینے اور اس کے جوار میں منزل کرنے کیلئے وہ تیزی سے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی جعلسازی، فریب کاری اور مکاری نہ ہونا چاہیے۔

اور مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ: ایسی سختیوں کو برداشت کرنا جن سے نجات کی اور اچھے انجام کی امید ہو اس گناہ سے بہتر ہے جس کے نتیجے میں تمہاری دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں۔

وَلَا تَعْقِدْ عَقْدًا تَجُوْزُ فِيْهِ الْعِلَلُ، وَلَا تُعَوِّلَنَّ عَلٰى لَحْنِ قَوْلٍ بَعْدَ التَّأْكِيْدِ وَ التَّوْثِقَةِ، وَلَا يَدْعُوَنَّكَ ضِيْقُ اَمْرٍ لَّزِمَكَ فِيْهِ عَهْدُ اللّٰهِ اِلٰى طَلَبِ انْفِسَاخِهٖ بِغَيْرِ الْحَقِّ، فَاِنَّ صَبْرَكَ عَلٰى ضِيْقِ اَمْرٍ تَرْجُو انْفِرَاجَهٗ وَ فَضْلَ عَاقِبَتِهٖ خَيْرٌ مِّنْ غَدْرٍ تَخَافُ تَبِعَتَهٗ، وَ اَنْ تُحِيْطَ بِكَ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ طِلْبَةٌ، فَلَا تَسْتَقِيْلَ فِيْهَا دُنْيَاكَ وَلَا اٰخِرَتَكَ.

اور ایسا کوئی معاہدہ کرو ہی نہ جس میں تاویلوں کی ضرورت پڑنے کا امکان ہو، اور معاہدہ کے پختہ اور طے ہو جانے کے بعد اس کے کسی مبہم لفظ کے دوسرے معنی نکال کر فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو، اور اس عہد و پیمانِ خداوندی میں کسی دشواری کا محسوس ہونا تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہونا چاہیے کہ تم اسے ناحق منسوخ کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ ایسی دشواریوں کو جھیل لے جانا کہ جن سے چھٹکارے کی اور انجام بخیر ہونے کی امید ہو، اس بد عہدی کرنے سے بہتر ہے جس کے برے انجام کا تمہیں خوف اور اس کا اندیشہ ہو کہ اللہ کے یہاں تم سے اس پر کوئی جواب دہی ہو گی، اور اس طرح تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی ہو گی۔

---

[1] نہج البلاغہ نامہ ۵۳

[2] نہج البلاغہ نامہ ۵۳

امیر المومنین علی علیہ السلام نے دشمن کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں اور دونوں سے مقابلہ کا طریقہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اگر دشمن چھپا ہوا ہو تو اس سے احتیاط سے کام لو اور اگر دشمن میدان میں اتر آئے تو اس سے کیسے جنگ کرنی ہے یہ آپؑ نے جنگ جمل میں جب علم اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو دیا تو ان سے فرمایا: تَزُوْلُ الْجِبَالُ وَلَا تَزُلْ، عَضَّ عَلٰى نَاجِذِكَ، اَعِرِ اللّٰهَ جُمْجُمَتَكَ، تِدْ فِي الْاَرْضِ قَدَمَكَ، اِرْمِ بِبَصَرِكَ اَقْصَى الْقَوْمِ، وَغُضَّ بَصَرَكَ، وَاعْلَمْ اَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ.

اے محمد! پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں مگر تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، اپنے دانتوں کو بھینچ لینا، اپنا کاسۂ سر اللہ کو عاریت دے دینا، اپنے قدم زمین میں گاڑ دینا، لشکر کی آخری صفوں پر اپنی نظر رکھنا اور (دشمن کی کثرت و طاقت سے) آنکھوں کو بند کر لینا اور یقین رکھنا کہ مدد خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

پس اس مختصر سی تحریر میں ہم نے امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی نگاہ میں دشمن کی پہچان اور اس سے مقابلہ کرنے کے طریقے سے آشنائی حاصل کی ہے۔ ہماری خداوند عالم سے دعا ہے کہ ہمیں امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بتائے ہوئے فرامین پر عمل کرتے ہوئے دشمن کی صحیح پہچان اور دین کے پوشیدہ اور آشکارہ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی جرات و طاقت عطا فرمائے آمین.

***

ابو سعید خدری نے کہا ہے:

كنا معشر الانصار نبور اولادنا بحبهم عليا (رضى الله عنه)، فاذا ولد فينا مولود فلم يحبه عرفنا انه ليس منا.

ہم انصار اپنے بچوں کو علی (رضی اللہ عنہ) کی محبت کے ذریعہ امتحان کرتے تھے پس جو بھی بچہ پیدا ہوتا تھا اور وہ حضرت علی سے محبت نہیں کرتا تھا تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ وہ ہم سے نہیں ہے۔ (اسنی المطالب: ۸ ص ۵۸، شرح ابن ابی الحدید ۱: ۳۷۳ (۴/۱۱۰، خطبہ ۵۶)

[1] خطبہ ۱۱ نہج البلاغہ

کردار علیؑ کی انفرادیت

ڈاکٹر رونق زیدی

یوں تو خیر و شر کے تصادم حق و باطل کی درگیری اور انسانیت و شیطنت کی ٹکر کی آوازیں فضائے تاریخ میں گونج رہی ہیں اور گونجتی رہیں گی۔ تاریخی جھروکوں سے عبرت انگریز مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اور آئندہ بھی دکھائی دیتے رہیں گے۔ دامن تاریخ خون کے چھینٹوں سے رنگین ہے اور بے گناہوں کا خون اس کی رنگینی میں اضافہ کرتا ہی رہے گا۔ مگر جو ظلم اور ناانصافیاں اہلبیت علیہم السلام کے ساتھ کی گئیں اس کی مثال کہیں نہ ملے گی۔

بعد رسولؐ حضرت علیؑ کو خلافت ملنی تھی۔ مگر انہیں ہمیشہ اس منصب سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رحلت فرمائی! فوراً ہی خلیفہ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ اتفاق رائے سے حضرت ابوبکر: کو مسند خلافت پر بٹھادیا گیا۔ اتفاقِ رائے کا یہ جمہوری طریقہ بھی عجیب سی بات لگتی ہے۔ خلیفہ کے انتخاب کے وقت حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ ایسی ذوات سے رائے نہیں لی گئی۔ یہ کونسا جمہوری طرز ہے؟ جمہوریت کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال اس واقعہ کے علاوہ نظر نہیں آتی۔ جہاں خلیفہ کا سلیکشن تو جمہوریت کے نام پر ہو مگر رائے شماری کے وقت چند مخصوص افراد ہی رائے شماری میں حصہ لیں۔ بہر کیف حضرت ابوبکر کا دور خلافت ختم ہوا تو سوچی سمجھی اسکیم کے تحت حضرت عمر تحت خلافت پر تشریف لائے۔ اور پھر حضرت عمر کے بعد اسلامی گورنمنٹ کے سربراہ کے روپ میں حضرت عثمان کے حکومت سنبھالتے ہی قریشی اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ خلافت خاندان رسالت میں نہ پہنچنے پائے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک مرتبہ خلافت چلی گئی تو پھر کبھی ہاتھ میں نہ آسکے گی۔

وہ ہر حالت میں حکومت پر قابض رہنا چاہتے تھے پہلے دو خلفاء کے زمانے میں تو انہیں اپنی طاقت کا زور دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر حضرت عثمان کے کرسی خلافت پر آتے ہی امویوں کو سنہرا موقع مل گیا۔ کیونکہ عثمان کا تعلق بنی امیہ سے تھا۔

خلافت کا مسئلہ اب تک اس طرح طے کیا جاتا تھا کہ مدینے کے اکابر مہاجرین و انصار کسی شخص پر اتفاق کر لیتے تھے، اور وہ خلیفہ مان لیا جاتا تھا- مگر یہ طریقہ بنی اُمیہ کے لئے سود مند نہ تھا۔ کیونکہ حضرت عثمان کے علاوہ تین اور اکابر مہاجر موجود تھے (علیؑ، طلحہ، زبیر) پرانے دستور کے مطابق انہیں میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنایا جاتا تھا۔ مگر ان کا تعلق بنی امیہ سے نہ تھا اور بنی امیہ چاہتے تھے کہ پرانا دستور ختم ہو جائے۔ انتشار پیدا ہو اور تلوار کے زور پر حکومت حاصل کی جائے۔ امویوں کو انتشار، بدامنی اور خانہ جنگی میں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، کیونکہ صدیوں سے حکومتیں انہیں کی دست نگر تھیں، اور ان کا لیڈر امیر معاویہ بن ابی سفیان، گورنر شام بہت طاقتور

تھا۔ ایک طرف تو یہ اموی سیاست تھی دوسری طرف اکابر مہاجرین میں طلحہ اور زبیر بڑے دولت مند تھے وہ حکومت کو اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانا چاہتے تھے، لیکن انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ملی تو عثمانی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے لگے۔ لوگوں کو حکومت کے خلاف ابھارنے لگے۔ دوسری طرف حضرت علیؑ تھے خلافت کو اپنا حق سمجھنے کے باوجود بھی مسند خلافت پر جلوہ گر ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ عثمانی حکومت کی خرابیاں اور بدعنوانیاں انہیں گراں ضرور گزر رہی تھیں۔ مگر وہ ان میں اصلاح کی غرض سے خلیفہ کو اپنے مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ حضرت عثمان کی حکومت کمزور ہوتی جارہی تھی۔ مخالفت زور پکڑتی گئی۔ مصر، بصرہ اور کوفے کے شرپسندوں نے آکر مدینے پر فوجی قبضہ کر لیا اور حضرت عثمان کو انکے گھر میں نظر بند کر دیا۔ حضرت عثمان نے حضرت علیؑ سے شورش پسندوں سے نجات دلانے کی درخواست کی۔ حضرت علیؑ مہاجرین اور انصار کے ساتھ مصریوں سے ملے اور انہیں سمجھایا۔ مصری اس بات پر راضی ہوگئے کہ اصلاح کی جائے۔ عبداللہ بن سرح کی جگہ محمد بن ابی بکر کو مصر کا گورنر بنادیا جائے۔ حضرت عثمان نے یہ سب مان لیا۔ حضرت علیؑ برابر حضرت عثمان کی مدد کرتے رہے۔ حضرت عثمان ایک طرف حضرت علی سے مدد مانگتے رہے اور دوسری طرف مروان سے بھی ملے رہے، آخر میں حضرت علیؑ نے عثمان کی نے حمایت کرنا چھوڑ دیا۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد تین نام خلافت کے لئے تھے۔ مگر قتل کے بعد طلحہ اور زبیر کی پوزیشن کمزور ہوگئی۔ اب حضرت علیؑ کا نام ہی باقی رہ جاتا ہے، جس کی مخالفت نہ کی گئی۔ شرپسندوں نے پورے مدینہ میں دہشت اور سراسیمگی پھیلادی۔ حکومت کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ چاروں طرف فسادات پھیل گئے۔ اس پر آشوب اور ہنگامی حالات میں حضرت علیؑ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ خلافت کی کرسی سنبھالتے ہی حضرت علیؑ کو بہت سی پریشانیوں نے آگھیرا- سب سے بڑی مشکل تو حضرت عثمان کے قتل نے کھڑی کر دی۔ ان کے قتل کا انتقام لیا جائے۔

حضرت علیؑ نے بڑے اصرار کے بعد مسند خلافت کو سنبھالا تھا۔ انھوں نے مسجد میں ایک خطبے میں یہ بھی کہا تھا۔ "یہ معاملہ میں پسند نہیں کرتا تھا مگر تمہارا اصرار جاری رہا کہ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ میری حکومت خود خواہ حکومت نہ ہوگی۔ بلکہ تمہارے مشورے سے چلے گی۔ بیت المال کی کنجیاں تو میرے پاس رہیں گی مگر ایک پیسہ بھی تمہاری مرضی کے بغیر نہ لوں گا۔ کیا تم یہ سن کر بھی حکومت چاہتے ہو۔

سب نے بخوشی یہ بات مان لی، طلحہ اور زبیر نے کوفہ اور بصرہ کا گورنر بننے کی پیش کش کی جس کو حضرت علیؑ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ تو طلحہ اور زبیر نے مکہ جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت علیؑ نے اجازت دیدی۔ طلحہ اور زبیر نے یہ سب کچھ معاویہ کی پلاننگ پر کیا تھا، معاویہ کے خط طلحہ اور زبیر کے پاس پہنچتے تھے، جس میں لکھا تھا کہ حضرت علیؑ کو تخت خلافت سے اُتارا جائے اور حضرت عثمان کے قتل کے خلاف صف آرائی کی جائے۔ معاویہ نے مشورہ دیا کہ وہ مکہ جائیں جہاں یمن کے عثمانی گورنر ان کی ہر ممکن مدد کرینگے۔ حضرت عائشہ پہلے سے مکہ میں موجود تھیں۔ معاویہ نے لکھا حضرت عائشہ کو بھی اپنی طرف کر لیا جائے، بنی امیہ کے جو

لوگ مکہ میں ہیں وہ بھی ساتھ دینگے۔ سب مل کر عراق جائیں گے۔ اور اس پر قبضہ کرلیں گے، غرض پورا محاذ تیار ہو گیا۔ معاویہ چاہتا تھا کہ طلحہ اور زبیر حضرت علی سے ٹکرا جائیں، فتح کسی کی بھی ہو۔ بعد میں جیتنے والا کمزور ہو جائے گا۔ پھر مجھے اپنی سلطنت قائم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی۔ معاویہ کی یہ پالیسی کامیاب رہی۔ طلحہ، زبیر اور حضرت عائشہ اور بہت سے لوگ بصرہ کی طرف چل دیئے۔ حضرت علیؑ بھی مقابلے کے لیے روانہ ہوئے بصرے کے سامنے دونوں فوجوں کا ڈٹ کر سامنا ہوا۔ حضرت علیؑ خونریزی نہیں چاہتے تھے وہ عوام کے تحفظ کی ضمانت چاہتے تھے۔ عوام کی فلاح و بہبود اور خوشحالی ہی حضرت علیؑ کا مطمع نظر تھا۔ مگر جنگ ہوئی۔ جو اسلامی تاریخ میں جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں تقریباً دس ہزار آدمی مارے گئے۔ طلحہ اور زبیر بھی مارے گئے۔ جمل کی لڑائی ختم ہو گئی۔ مگر معاویہ سیاسی منصوبے بناتا ہی رہا، شاہانہ تزک و احتشام اور سلطنت کے جاہ و جلال سے اس کی آنکھیں چکاچوند تھیں۔ حضرت علیؑ کو منصب خلافت سے اتارنے کے لئے وہ اپنی دولت کو پانی کی طرح بہا سکتا تھا۔ جس کی اُس کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ دولت کے زور پر سب اس کی طرف چلے آئے، جس میں سب سے بڑی شخصیت عمرو بن العاص کی تھی۔ وہ بھی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اس کو صرف مصر کا تخت چاہیئے تھا۔ معاویہ نے مصر کی حکومت اس کو دینے کا وعدہ کر لیا۔ یہ معاویہ کی ڈپلومیسی تھی۔ سیاست میں اس کے لیے سب جائز تھا۔ اپنی ترقی اور عروج کے لیے ہر برے سے برے کام کو درست مانتا تھا۔ اس کے برعکس حضرت علیؑ تھے جو حق پرست تھے - انصاف اور احکام خدا سے ذرا بھی تجاوز نہ کرتے تھے۔ ان کی نظر میں شاہانہ جاہ و جلال کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ انہیں حکومت کی کرسی نہیں انسانی فلاح و بہبود چاہیے تھا۔ وہ اپنے مستقبل کے لیے سنہرے خواب نہیں دیکھتے تھے، بلکہ عوام کے لیے خوش آئند مستقبل کے خواب بن رہے تھے، حضرت علی کو ملک گیری کا شوق نہ تھا وہ اپنے لیے عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرانے کی خواہش نہ رکھتے تھے۔ یہ ہی حضرت علیؑ کے کردار کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے لیکر خلافت تک، اس بیس سال کے عرصہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ کو کتنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، کیسی مصیبتیں اور پریشانیاں درپیش آئیں۔ دشمنوں کے ظلم کی کوئی انتہا نہ چھوڑی، یوں تو انسانی زندگی غم اور خوشی سے مل کر ہی تمام ہوئی ہے بقول نطشہ "درد کے روحانی بن جانے کا نام ہی ترقی ہے"

مگر حضرت علیؑ کی پوری زندگی پر روشنی ڈالنے سے یوں لگتا ہے۔ ان کی پوری زندگی صرف غموں مصیبتوں اور پریشانیوں کی آماجگاہ تھی۔ جس پر ظلم اور مخالفتیں ہر وقت اپنا پردہ ڈالے رہتی تھیں۔ پچیس سال تک ان دشوار گزار مرحلوں سے گزرنے اور ناانصافیوں کو برداشت کرنے کے بعد زمام حکومت سنبھالی تو وہ بھی ایسے وقت میں جب چاروں طرف انتشار اور افراتفری کا دور تھا معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم تھا۔ معاشی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اخلاقی اور تہذیبی قدریں ختم ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں حضرت علیؑ کی ہی شخصیت تھی یہ انھیں کا کردار تھا کہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ جن بلوائیوں

نے حکومت وقت کی بنیادوں کو ہلا ڈالا تھا اُن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا۔ معاویہ سے گھاٹ لیکر واپس کر دینا یہ حضرت علیؑ کی ہی دریا دلی اعلی ظرفی کا کام ہے، مروان جیسے مخالف کو جنگ جمل کے بعد قید سے آزاد کر دینا انہیں کا حسن ظن ہے۔ عبد اللہ ابن زبیر جو حضرت علیؑ کو نازیبا الفاظ سے یاد کرتا جو کسی بھی طرح ایک اچھا انسان کہلانے کا حق دار نہیں، اس کے ساتھ بھی حضرت علیؑ خوش دلی سے پیش آئے ۔ آپکی ذات تو مجمع الصفات ہے ۔ دنیا کے تمام محاسن کمالات اور اوصاف کا مکمل مجسمہ ہے ۔ کردار علی کی انفرادیت نہ ختم ہوئی ہے نہ کبھی ہو سکے گی۔

مدح حضرت مولا علی علیہ السلام

مولوی مجتہد الدین احمد صاحب عیش بدایونی شاگرد امیر مینائی

شب ہجرت علی نے بھی عجب خدمت گزاری کی
مَلک بھی جس سے حیراں ہو گئے وہ جاں نثاری کی

تمہارا اے علی مرتضی واللہ کیا کہنا
ادا کرتے ہیں یوں حق اُخوت واہ کیا کہنا

جو بندے تابع حکم شہ ابرار ہوتے ہیں
وہ یوں بیخوف مرنے کیلئے تیار ہوتے ہیں

جری و مرد میدانِ تہور ایسے ہوتے ہیں
شجاعت اس کو کہتے ہیں بہادر ایسے ہوتے ہیں

کہیں آزردہ ہو سکتے ہیں مرد ایسے ملالوں سے
وہ تھے شیر خدا کیا خوف کرتے ان شغالوں سے

علی کے مرتبوں کا حال کوئی اور کیا جانے
جناب سرور کونین جانیں یا خدا جانے

علی ہی سرور ان گلشن رشد و ہدایت ہے
علی مولائے امت ہے علی شاہ ولایت ہے

علی کی ذات والا وجہ فخر زہد و طاعت ہے
علی کا روئے انور دیکھنا عین عبادت ہے

علی وہ ہیں جو یکتا فن تیغ آزمائی میں
علی وہ ہیں نہیں جن سا کوئی مشکل کشائی میں

علی دنیا کے مولا ہیں علی اُمت کے والی ہیں
علی اعلیٰ و اکمل ہیں علی اولیٰ و عالی ہیں

علی ہیں نفس پیغمبر علی ہیں ساقیء کوثر
علی ہیں قاتل مرحب علی ہیں فاتح خیبر

علی تھے اس قدر مقبول سرکار پیمبر میں
کہا ہے لحمک لحمی علی کی شان برتر میں

کبھی اپنی ردائے پاک اڑھا کر شاد فرمایا
کبھی من کنت مولاہ سے اُن کو یاد فرمایا

کبھی آشوب سخت چشم سے اُن کو اماں بخشی
کبھی شمشیر ذوالفقار جاں ستاں بخشی

علی ہیں اہل بیت مصطفیٰ میں یہ روایت ہے
وہی ہے مومن کامل جسے اُن سے محبت ہے

خدا کے گھر میں پیدا ایش ہوئی جن کی علی وہ ہیں
سخی وہ ہیں غنی وہ ہیں جری وہ ہیں ولی وہ ہیں

حضرت علیؑ اور جویریہ کی خواستگاری کا افسانہ

ترتیب و تالیف مولانا مفتی جعفر حسین مرحوم

حضرت علی علیہ السلام نے جناب فاطمہ زہراؑ کی زندگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں کیا اور نہ ہی ان کی موجودگی میں دوسرے عقد کا ارادہ کیا۔ مگر کچھ دسیسہ کاروں نے حضرت علی علیہ السلام کو مطعون کرنے کے لئے ایک بے سروپا روایت گڑھ لی کہ حضرت علی علیہ السلام نے ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ کی بیٹی سے جس کا نام جویریہ یا جمیلہ بیان کیا جاتا ہے عقد کرنا چاہا اور یہ امر پیغمبر ﷺ کو انتہائی ناگوار گزرا اور آپ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ چنانچہ مورا ابن مخرمہ بیان کرتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے ابو جہل کی لڑکی سے رشتہ کرنا چاہا جب جنابِ فاطمہ علیہا السلام کو علم ہوا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس شکوہ لے کر آئیں اور کہا کہ آپ کے قوم و قبیلہ والے آپؐ کے متعلق یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی ذرا پاسداری نہیں کرتے اب علی علیہ السلام آپ کی بیٹی پر سوت لا رہے ہیں اور ابو جہل کی لڑکی سے رشتہ جوڑ رہے ہیں آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور آپؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: **انی لست احرم حلالا ولا احل حراما ولکن واللہ لا تجتمع بنت رسول ص اللہ وبنت عدوّ اللہ عند رجل واحد۔**[1] ''میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا لیکن خدا کی قسم رسول ﷺ کی بیٹی اور دشمنِ خدا کی بیٹی دونوں ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔''

فلا اٰذن ثم لا اٰذن ثم لا اٰذن الا ان یحب ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی وینکح ابنتھم[2] ''میں اجازت نہیں دیتا میں اجازت نہیں دیتا میں اجازت نہیں دیتا مگر یہ کہ فرزندِ ابو طالبؑ یا تو میری بیٹی کو طلاق دے دے اور ان کی لڑکی سے نکاح کر لے۔''

اس قسم کی اور بھی مختلف و مضطرب روایتیں ہیں جو مورا ابن مخرمہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ شخص عبد الرحمٰن ابن عوف کا بھانجا تھا اور ہجرت کے دو سال بعد مکہ میں پیدا ہوا اور ۸ھ کے اواخر میں مدینہ آیا۔ ابنِ حجر عسقلانی نے تحریر کیا ہے:۔ **ولد بمکۃ**

---

[1] تاریخ خمیس۔ ج ا۔ ص ۴۱۲

[2] تاریخ خمیس۔ ج ا۔ ص ۴۱۲

بعد الهجرة بسنتين فقدم به ابوه المدينة عقب ذی الحجّه سنة ثمان.(تہذیب التہذیب۔[1] ''ہجرت کے دو سال بعد مکہ میں پیدا ہوا اور آخر ذی الحجہ ۸ ھ میں اپنے باپ کے ساتھ مدینہ آیا۔''

صاحبِ اصابہ نے تحریر کیا ہے: ۔ کان مولدہ بعد الهجرة بسنتين وقدم المدينة ذی الحجة بعد الفتح ستة ثمان وهو غلام ايفع ابن ست سنين[2]۔ ''ہجرت کے دو برس بعد پیدا ہوا اور فتح مکہ کے بعد ذی الحجہ سن ۸ ھجری میں مدینہ آیا اور اس وقت وہ چھ برس کا نوخیز بچہ تھا۔''

مکہ ۸ ھ میں فتح ہوا اور یہ خواستگاری کا واقعہ بھی ۸ ھ میں یا اس کے بعد ہوا ہوگا کیونکہ فتح مکہ سے پہلے ابو جہل کی اولاد اسلام نہ لائی تھی۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب بلال نے خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر اذان دی تو اسی جویریہ بنتِ ابی جہل نے اپنے کفر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: ۔ لقد اکم الله ابی حين لم يشهد نهيق بلال فوق الكعبة[3] ''خدا نے میرے باپ کو اس سے محفوظ رکھا کہ وہ کعبہ میں بلال کی بے ہنگم آواز سنتا''۔

اور کسی کافرہ و مشرکہ سے تو نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیران کن امر یہ ہے کہ بزرگ صحابہ تو خاموش نظر آتے ہیں اور ایک زائد سے زائد چھ سال کا بے شعور بچہ جو ان معاملات کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا بڑے شد و مد سے اس اہم واقعہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ حدیث قرطاس کے سلسلہ میں ابن عباسؓ کی صغر سنی پر جرح و قدح کرنے والے علماء اس مجہول و نامعروف بچے کی طفلانہ شوخی کو اٹھائے پھرتے ہیں حالانکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو مخفی رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور جس کی شہرت عام ہونا چاہیے تھی خصوصا عورتوں کے طبقہ میں اس کا عام چرچا ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود اس زمانے کے زن و مرد کا خاموش رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ سرے سے غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو امیرِ شام جنہوں نے برائی ڈھونڈھ نکالنے کا کوئی گوشہ نہ چھوڑا تھا کسی موقع پر تو اس کا ذکر کرتے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ کو اپنی زندگی میں اکثر ایسے مواقع پیش آئے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتیں مگر ان کا بھی اس معاملہ میں سکوت ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ یہ قطعا من گڑھت بچوں کی کہانی ہے۔

اس کے علاوہ حضرتِ علی علیہ السلام کی سیرت پر نظر کرنے سے بھی یہ واقعہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت کی تاریخ حیات میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں ملتی کہ حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم یا مشورہ کے بغیر کوئی قدم اٹھایا ہو یا کوئی ایسا اقدام کیا ہو جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذرا سی ناگواری کا اندیشہ محسوس کیا ہو اور نہ آپ کی پاکیزہ فطرت اس کی روادار ہو سکتی تھی کہ ایسی بات کا تصور بھی

---

[1] ج ۱۰۔ ص ۱۵۱

[2] اصابہ۔ ج ۳۔ ص ۳۹۹

[3] تاریخ ابو الفداء۔ ج ۱۔ ص ۱۴۵

کریں جو رسول اللہ ﷺ کی ادنٰی ناراضی کا باعث ہو سکتی ہو تو ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ نہ اپنے ولی و سرپرست سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کریں اور نہ ان کی رضا و عدم رضا کا خیال کریں اور بالاہی بالا رشتہ طے کرنے لگ جائیں جبکہ ابو جہل کی اولاد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کا عندیہ معلوم کریں شاید انہیں یہ گوارا نہ ہو کہ ان کی دختر پر سوت آئے

پھر اس واقعہ کے سلسلہ میں جو کلمات آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان کی صحت پر وہی اعتماد کرے گا جو منصبِ نبوت کے تقاضوں سے بے خبر ہو۔ منصبِ نبوت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ جذبات سے بلند تر ہو کر حلالِ خدا کو حلال کہیں اور حرامِ خدا کو حرام اور ذاتی لگاؤ کی بناء پر اس میں کوئی تفریق پیدا نہ کریں۔ لہٰذا ہماری عقلیں یہ باور نہیں کر سکتیں کہ جس رسول ﷺ نے شرعی احکام کے سلسلہ میں کبھی ذاتی تعلقات کا لحاظ نہ کیا ہو وہ محض اپنی بیٹی کی محبت میں خدا کے حلال کردہ امر کی مخالفت کریں گے۔ رسول ﷺ تو بڑی ہستی ہیں جبکہ احکامِ خدا اور رسول ﷺ کا تھوڑا سا پاس و لحاظ رکھنے والے شہنشاہ جن کا غرور شاہی احکام خدا اور رسول ﷺ کو پس پشت ڈالنے کے لئے آمادہ رہتا ہو وہ بھی ایسے موقع پر بیٹی کی محبت کا خیال کرتے ہوئے احکامِ خدا اور رسول ﷺ کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام کے مشہور شہنشاہ مامون عباسی نے اپنی بیٹی امّ الفضل کا عقد امام محمد تقیؑ سے کیا اور امام اسے اپنے ہمراہ مدینہ لے گئے۔ مدینہ سے اس نے اپنے باپ مامون کو تحریر کیا کہ امام محمد تقیؑ نے کچھ کنیزیں بھی اپنے گھر میں ڈال لی ہیں۔ مامون نے سیخ پا ہونے کے بجائے اپنی بیٹی کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھا۔

انالم نزوجك له لنحرم عليه حلالا فلا تعودی لمثله"[1] "ہم نے ان سے تمہارا عقد اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کے کئے حلالِ خدا کو حرام قرار دیں لہٰذا آئندہ ایسی بات نہ دہرائی جائے۔"

جب مامون ایسے حکمران اور دنیوی فرمانروا کو حلالِ خدا کا اتنا پاس ہو کہ وہ اپنی بیٹی کی شکایت کو درخور اعتنا نہ سمجھے تو پیغمبر اکرم ﷺ جو حلال و حرامِ خدا کی تعلیم دینے آئے تھے ان کے متعلق کیونکر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ حلالِ خدا کا کوئی پاس و لحاظ نہ کریں گے اور اپنی بیٹی پر سوت آجانے کے خیال سے اتنا بر افروختہ ہوں گے کہ مسلمانوں کے بھرے مجمع میں منبر پر اپنی خفگی و ناراضی کا اعلان فرمائیں گے۔ کیا آنحضرت ﷺ حضرت علیؑ کو سمجھا چکے تھے۔ کہ اور وہ مخالفت و نافرمانی پر اصرار کر رہے تھے کہ اب منبر پر اس کا ذکر ضروری ہو گیا تھا یا یہ بھی کوئی شرعی حکم کی حیثیت رکھتا تھا جس کی علانیہ تبلیغ ضروری تھی کہ رسول ﷺ کی بیٹی اور دشمنِ خدا کی بیٹی ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔

کیا اس موقع پر یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جب کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ رسولِ خدا ﷺ کی بیٹیاں کافروں اور خدا کے دشمنوں سے بیاہی گئیں تو ایک دشمنِ خدا کی بیٹی جو مسلمان بھی ہو چکی ہو دخترِ رسول ﷺ کے ساتھ کیوں جمع نہیں

[1] صواعق محرقہ۔ ص ۱۲۳

ہو سکتی۔ اور پھر خود رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں کافر و مسلم باپ کی بیٹیاں موجود تھیں اور آپ ﷺ نے ام حبیبہ بنتِ ابو سفیان اور صفیہ بنتِ حیی سے عقد کے وقت یہ خیال نہ کیا کہ یہ دشمنانِ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ تو جس چیز پر آنحضرت ﷺ نے خود عمل فرمایا ہو اور اسے برا نہ سمجھا ہو اسے دوسرے کے لئے معیوب قرار دینا کہاں تک روا اور انصاف کا متقاضی ہو سکتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب کچھ لوگوں کو امیر المومنین علیہ السلام میں کوئی نقص و عیب ڈھونڈھے سے نہ مل سکا، اور کوئی بات بنائی بھی تو اس کا تار پود بکھر گیا تو انہوں نے تنقیص کا وہ طریقہ اختیار کیا جو کسی کی تنقیص کا موثر ترین ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ تنقیص کا پیرایہ بیان ہمدردانہ ہو۔ چنانچہ یہاں پر راوی تاثر تو یہ دیتا ہے کہ وہ جنابِ سیّدہ س کی فضیلت اور پیغمبر ﷺ کی نگاہوں میں ان کی اہمیت دکھانا چاہتا ہے مگر تنقیص کرتا ہے کہ وہ علی ﷺ کی اور وہ بھی پیغمبر اکرم ﷺ کی زبان سے اگر صرف حضرت علی علیہ السلام کی تنقیص ہوتی تو ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کے آنسو پُنچھ جاتے مگر یہاں تو اس نے خود رسول ﷺ کی بھی تنقیص کر دی اس طرح کہ حضور ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو الگ بلا کر سمجھانے کے بجائے ایک مجمع کر کے خطبہ دے ڈالا اور خطبہ بھی ایسا جو قرآنی اجازت کے بھی خلاف اور خود عملِ رسول ﷺ کے خلاف ہو

روایت کے اس پہلو اور اس کے اضطراب و اختلاف کو دیکھ کر ارباب بصیرت خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ روایت کسی واقعہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف اس ہستی کی توہین کے لئے وضع کی گئی ہے جس سے رسول ﷺ آخر وقت تک خوش اور انتہائی خوش رہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت اس قابل نہ تھی کہ اس کا تذکرہ کیا جاتا اور بہتر بھی یہی تھا کہ جو شے اکابر صحابہ کی زبان پر نہیں آئی وہ ہماری زبانِ قلم پر بھی نہ آتی۔

کتاب//سیرتِ امیر المومنین ع//جلد اول//ص ۱۹۲تا۱۹۵//ترتیب و تالیف مولانا مفتی جعفر حسین رح//مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

* * *

حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی سیرت میں عفت و پردہ داری

ڈاکٹر شاذیہ مہدی

پردہ داری اور عفت و حیا کی محافظت اسلام کے فرائض اور واجبات میں سے ہے۔ عفت و حیا کا حجاب کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے کیونکہ حجاب کی پابندی سے ہی، عفت کا جوہر حاصل ہوتا ہے۔ عفت و پردہ داری عورت کی سب سے قیمتی زینت ہے۔ معاشرہ کو بے حیائی اور بربادی کے سیلاب سے بچانے کا بہترین ذریعہ عفت اور پردہ داری ہے۔ یہ ان عوامل میں سے ایک ہے جو لوگوں کو غیر معقول اور خود ساختہ لامحدود خواہشات سے روکتا ہے اور وہ واحد ذریعہ ہے جس سے معاشرہ صحیح معنی میں برائیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، عفت اور پردہ داری کو اپنائے بغیر نہ بے حیائی ختم ہو سکتی ہے نہ آوارگی، اور نہ انسان حقیقی کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ یقینا پردہ داری پوری انسانی برادری کو پر سکون اور باوقار زندگی عطا کرنے کی فطری تدبیر اور یقینی ضمانت ہے، اسی لیے قرآن کریم کی آیات اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں عفت اور پردہ داری پر زور دیا گیا ہے اور اس کے احکام بتائے گئے ہیں۔ حجاب کی تحفظ کے لیے ہمارے لیے بہترین نمونہ شیر خدا علی مرتضیٰ علیہ السلام کی بیٹی زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا ہے جنہوں نے اپنے کردار، گفتار اور رفتار سے ہمیں پردہ کی اہمیت اور ضرورت سے روشناس کیا ہے

عورت کی تخلیق اور وجود کی نزاکت کی وجہ سے، خدا نے اسے نامحرموں کی رسائی سے بچانے کے لیے ایک تدبیر کی ہے۔ حجاب اور اسلامی عفت معاشرے کے ارکان بالخصوص خواتین کی شخصیت کے تحفظ کی ضمانت دیتے ہیں۔ حجاب کا مطلب ایسا لباس ہے جس کی مدد سے عورت معاشرتی اور ذہنی نقصان کے بغیر معاشرے میں اپنے مذہبی، سماجی اور گھریلو فرائض انجام دے سکتی ہے۔

عورتوں اور مردوں کے ذہنی سکون اور سلامتی کو نقصان دہ عوامل سے بچانے کے لیے اسلام نے عورتوں کے لیے حجاب اور عفت کو فرض کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حجاب خواتین کے لیے تحفظ اور حقیقی شخصیت اور شناخت کا احساس پیدا کرتا ہے اور مردوں بالخصوص معاشرے کے نوجوانوں کو شیطانی فتنوں اور وسوسوں سے دور رکھتا ہے اور جنسی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ اسی لیے معاشرہ کو پر سکون بنانے اور بے حیائی سے روکنے کے لیے عفت اور پردہ داری پر خاص توجہ دینی چاہیے تاکہ امن و سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون اور ذہنی توازن برقرار رکھا جائے۔ لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہمیں ایک موزوں اور بہترین رول ماڈل کی ضرورت ہے۔ حضرت زینب کبری سلام اللہ علیہا حجاب اور عفت کے

معاملے میں خواتین کے لیے نمایاں نمونہ عمل ہے۔ جن کی تمام زندگی عفت اور پاکدامنی میں گزری ہے۔ عاشورا کے دروس میں سے ایک اہم ترین درس عفت و حجاب کا ہے۔ واقعہ کربلا میں جس چیز کی زینب کبریٰؑ اور دیگر خواتین حتیٰ کہ بچوں نے بھی بار بار حجاب کی اہمیت کو اجاگر کیا ۔ لہٰذا حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے سیرت و کردار کا مطالعہ کرنے سے ہمیں اس عظیم الٰہی فریضہ کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ زینب سلام اللہ علیہا نے حجاب کے خاطر اپنی جان دینے اور قید میں جانے کے لیے گریز نہیں کیا، وہ اپنی عفت اور پردے کا خیال قیمتی جواہر سے بھی زیادہ رکھتی تھی۔ آپ کسی بھی حالت میں نامحرموں کے سامنے آنے کو تیار نہیں ہوتی تھی کیونکہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا خدا کی راہ میں قتل ہونے کو زینت اور اجنبیوں، نامحرموں میں شامل ہونے کو عذاب اور رسوائی سمجھتی تھی۔ آپؑ نے اپنی عفت اور پردہ داری کو برقرار رکھتے ہوئے کربلا کو کربلا سے نکال کر پورے عالم میں متعارف کرایا، اور اس رسن بستہ خاتون نے پردہ کے تحت استعمار و استبداد کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی اور نوع انسان کو مظلومیت کے ہتھیار سے ظالم کو زمین بوس کرنے کا سلیقہ سکھادیا۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے نانا کی نواسی، علی مرتضیٰؑ جیسے عظیم المرتبت باپ کی بیٹی، خاتون جنّت، فاطمۃ الزّہرا سلام اللہ علیہا جیسی عظیم ماں کی لخت جگر، حسن و حسین علیہما السلام جیسے جنت کے جوانوں کے سردار بھائیوں کی بہن ہے ۔ آپؑ نے عصمت و طہارت کی فضاؤں میں آنکھیں کھولی ،معصوم آغوش میں پرورش پائی، پاکیزہ ہاتھوں نے پروان چڑھایا، لوریوں میں قرآن کی آیات کو سنا۔ چنانچہ مؤلف اپنی کتاب 'نمونہ صبر زینب' میں لکھتے ہیں. ''زینب نے ایسے گھر میں رشد و تربیت پائی کہ جو خانوادگی زندگی کے لئے بلند ترین نمونہ ہے تاریخ بشریت میں ایسی عظمت و بزرگی کا حامل خاندان نہیں ملتا، اور نہ آئندہ دکھائی دے گا، زینبؑ کی شخصیت اس گھر میں پروان چڑھی، جس میں نور ایمان چمکتا تھا، وہ گھر جس میں علیؑ سا باپ اور فاطمہؑ جیسی ماں تھیں، ماں باپ دونوں معصوم، دونوں نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس پاک تھے، جن کی فعالیت اور محرک صرف فریضہ الٰہی کو انجام دینا تھا،''[1]

عفت و عصمت عورتوں کی سب سے خوبصورت زینت اور ان کے لیے سب سے قیمتی زیور ہے۔ زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے پدر گرامی کے مکتب میں عفت کا سبق اچھی طرح سیکھا، کہ جن کا یہ فرمان صفحہ قرطاس پر نور خورشید کی مانند چمک رہا ہے:

وَ قَالَ مَا الْمُجَاهِدُ الشَّهِيدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَعْظَمَ أَجْراً مِمَّنْ قَدَرَ فَعَفَّ لَكَادَ الْعَفِيفُ أَنْ يَكُونَ مَلَكاً مِنَ الْمَلَائِكَة. "خدا کی راہ میں شہید ہونے والے کا ثواب اس پاک دامن کے اجر سے زیادہ نہیں ہے جو گناہ پر قدرت رکھتا ہو لیکن پھر بھی گناہ میں آلودہ نہ ہو بلکہ عفیف فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے۔"[2] حضرت علی علیہ السلام کی تربیت کے کیا کہنے امام علیؑ

---

[1] نمونہ صبر زینبؑ ص ۳۶

[2] سید رضی، نہج البلاغۃ، دشتی، محمد، ج ۴۷۴، ص ۴۱۷

کی تربیت تو خود پیغمبر اکرمؐ نے کی تھی۔ اور اس اعتبار سے علیؑ کی تربیت دراصل تربیت رسول ہے جو ہمہ جہت اسلامی اقدار سے ہم آہنگ تھی یہی وجہ ہے کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شخصیت حسنِ تربیت اور عفت و پردہ داری میں جیتی جاگتی مثال بن گئی۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا اپنے کردار سے عفت اور پردہ داری کا درس دیتی ہیں آپؑ ایسی باعفت خاتون تھی جسے اپنے والد اور بھائیوں کے دور میں سوائے واقعہ کربلا کے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ یحییٰ مازنی روایت کرتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں ایک طویل عرصہ حضرت علیؑ کی خدمت میں گزارا اور میرا گھر امیر المومنینؑ کی بیٹی حضرت زینبؑ کے گھر کے قریب تھا۔ خدا کی قسم میری کبھی بھی ان پر نگاہ نہیں پڑی اور نہ ہی کبھی ان کی آواز سنی۔

حضرت زینبؑ نے بچپن میں قبر رسول ﷺ کی زیارت کی خواہش ظاہر کی تو اسطرح گھر سے نکلی کہ، امام حسن علیہ السلام آپ کے پیچھے اور امام حسینؑ ان کے آگے چلے اس کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام نے یہ ہدایت کر دی تھی کہ داخل ہونے کے بعد روضہ اقدس کا چراغ بھی خاموش کر دیا جائے تاکہ نامحرموں کی نگاہیں آپ کی بیٹی پر نہ پڑیں[1]

اس روایت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ خانہ نبوت میں مخدراتِ عصمت کے پردے کتنا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا اور کتنا پردہ کی نسبت حساس تھے یہی وجہ ہے کہ کربلا میں حضرت زینبؑ نے پردے کے تحفظ کو تحریک کی شکل دے دی۔ اور جہاں بھی گئیں ملت کی خواتین کے لئے یہ درس دیتی گئیں کہ پردہ عورت کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو روح جسم کے لئے رکھتی ہے۔ لہذا آپؑ نے مشکل ترین حالات میں بھی اپنی عفت کا مظاہرہ کیا۔ اسیری کے دوران کربلا سے شام تک عفت اور پردہ داری کا خیال رکھا۔ مورخین نے لکھا ہے: **دخلت زینب علی ابن زیاد و ھی تستر وجھھا بکمّھا** .وہ اپنے چہرے کو اپنی آستین سے ڈھانپتی تھی۔ کیونکہ ان کی چادر ان سے چھین لی گیی تھی۔[2]

حضرت زینبؑ نے قرآنی ہدایات اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی زندگی کے مطابق عفت و حجاب کا بہت زیادہ خیال رکھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے آپ کو اسیری کے دوران چادر تک محدود نہیں رکھا اور چادر کے علاوہ ان کے پاس خمار، پیراہن اور نقاب بھی تھا اور یہاں تک کہ چادر چھننے کے بعد اپنے چہرے کو ڈھانپنے کے لیے کپڑا بھی استعمال کیا۔ لیکن ان کی نظر میں چادر چھیننا حجاب نہ ہونے کے برابر تھا۔

ہمارے معاشرے کی خواتین کو چاہیے کہ زینب سلام اللہ کے نقش قدم پر چل کر اپنے پردے کی محافظت کریں۔ زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے چہرے کو آستین سے ڈانپ لیا تاکہ خواتین کو اس چادر کی اہمیت کو سمجھ سکے کیونکہ ہر دور کے یزید اور اسلام کے

---

[1] زینب قہرمان دختر علیؑ ص ۶۴، ۶۳

[2] خصائص زینبیہ، محقق: باقری بیدہندی، ناصر، ص ۱۵۶

دشمنوں کی نظریں بھی عورت کے پردہ پر ہی ہوتی ہے تاکہ معاشرے میں بے شرمی اور بے حیایی بڑھ جایے اور دشمن اپنی نفسانی خواہشات اور شیطانی مقاصد کو پورا کر سکے۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد کوفہ کے راستے میں ایک مشکل صورت حال کے باوجود بھی اپنی آخری سانس تک اس بات کا خیال رکھا کہ پردہ نہ چھوٹے۔ حضرت زینبؑ کی عفت اور عظمت ایسی ہے کہ دشمن نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے جب خاندان عصمت اسیر ہو کر کوفہ پہنچا تو ایک ہنگامہ اور شور و غل تھا کوئی خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا تو ایسے میں حضرت زینبؑ نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا جس کی وجہ سے سانس سینوں میں رک گئی اور گھنٹیوں اور ہنگاموں کی آوازیں بند ہو گئیں اور لوگ رک گئے۔ اس کے بعد آپؑ نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

راوی کہتا ہے: لَمْ أَرَ واللهِ خفِرَةً قطُّ أَنْطَقَ مِنْهَا كَأَنَّهَا تُفْرِغُ عَنْ لِسَانِ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِين۔ میں نے علی کی پیاری بیٹی زینب کو دیکھا اور میں نے ان سے زیادہ فصیح و بلیغ عورت کبھی نہیں دیکھی، گویا وہ امیر المومنین علیہ السلام کی زبان سے بات کر رہی تھی۔ شہید مطری کہتے ہے کہ "خَفِرہ" کا مطلب باحیا عورت یعنی علی کی شجاعت حیا و عفت سے آمیختہ تھی۔[1]

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا اسیری میں بھی اپنی والدہ فاطمہ زہراؑ کی سیرت پر پابند تھیں لہذا اسیری کے سخت حالات میں بھی جب نامحرموں سے بات کرنا ضروری ہوتا تھا تو بھی وہ عفت اور حجاب تاحد امکان رعایت کرتی تھیں۔

اس موقعے پر امام زین العابدین علیہ السلام نے آپ کے علمی اور عملی مرتبے کی تائید میں فرمایا: وَ أَنْتِ بِحَمْدِ اللهِ عَالِمَةٌ غَيْرُ مُعَلَّمَةٍ۔ الحمد للہ آپ عالمہ غیر معلّمہ ہیں"۔ یعنی ایسی عالمہ جن کو کسی نے تعلیم نہیں دی[2]۔

مقام رضا کے تمام تر منازل کو عبور کرنے کے بعد آپ نے مقام شکر کی روح پرور وادیوں میں یوں قدم رکھا تو آپ نے یہاں پر ایک نرالے انداز میں شکرِ خدا بجالایا۔ کہا جاتا ہے کہ جب قافلہ ابن زیاد لعنۃ اللہ علیہ کے دربار میں لایا گیا۔ اور اس نے حضرت زینبؑ کو یہ طعنہ دیا کہ جو کچھ امام حسینؑ اور ان کے اہل و عیال اور احباب و انصار کے ساتھ ہوا وہ خدا نے کیا تو ثانی زہرا نے جواباً کسی رنج و غم یا بے صبری کا اظہار نہیں کیا بلکہ نہایت ہی اطمنان بھرے لہجہ میں فرمایا: "مَا رَأَيْتُ إِلَّا جَمِيلاً"[3] میں نے اپنے لئے نیکی کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔

بازار شام میں جب حضرت زینبؑ اور ام کلثومؑ نے یہ مناظر دیکھے کہ تمام نامحرموں کی نظریں ان پر پڑ رہی ہیں تو ان نامحرم مردوں کی نگاہوں نے انہیں پریشان اور غمگین کر دیا۔ انہوں نے یزیدی فوج کے افسروں سے کہا کہ امام حسینؑ اور دیگر شہداء کے

---

[1] حماسه حسینی(ع)، مرتضی مطهری، ج ۱، ص ۴۱۱
[2] مظلومه کربلا ص ۳۲،سوگنامۂ آل محمّد ص ۴۲۴
[3] سوگنامه آل محمّد ﷺ ص ۴۲۵

سروں کو قافلے کے عقب یا قافلے کے آگے لے جائیں۔ تاکہ نامحرم مردوں کی توجہ خاندان عصمت کی خواتین کے بجائے، شہداء کے سروں کی طرف مبذول ہو جائے۔

دربار شام میں بھی حیاو عفت کی حدود کی حفاظت کے لیے آپؑ نے یزید کو پکار کر کہا: أَمِنَ الْعَدْلِ يَا ابْنَ الطُّلَقَاءِ تَخْدِيرُكَ حَرَائِرَكَ وَ إِمَاءَكَ وَ سَوْقُكَ بَنَاتِ رَسُولِ اللَّهِ سَبَايَا قَدْ هَتَكْتَ سُتُورَهُنَّ وَ أَبْدَيْتَ وُجُوهَهُنَّ تَحْدُو بِهِنَّ الْأَعْدَاءُ مِنْ بَلَدٍ إِلَى بَلَدٍ وَ تَسْتَشْرِفُهُنَّ الْمَنَاقِلُ وَ يَتَبَرَّزْنَ لِأَهْلِ الْمَنَاهِلِ وَ يَتَصَفَّحُ وُجُوهَهُنَّ الْقَرِيبُ وَ الْبَعِيدُ وَ الْغَائِبُ وَ الشَّهِيدُ وَ الشَّرِيفُ وَ الْوَضِيعُ وَ الدَّنِيُّ وَ الرَّفِيعُ

«اے ان لوگوں کے بیٹے جن کو ہمارے جد امجد (حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے وقت اسیر کیا تھا اور پھر آزاد کر دیا تھا، کیا یہ انصاف ہے کہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں کو پردے میں رکھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ کو اسیر بنا کر ادھر ادھر گھمیئے؟ تو نے ان کے نقاب چھین لئے اور ان کے چہروں کو ظاہر کر دیا۔"[1]

حضرت زینبؑ نے اپنے اس بیان سے حجاب کی اہمیت اور اس بات کو ظاہر کر دیا کہ ایک عورت کی عظمت اور وقار کے لئے حجاب لازم و ملزوم ہے۔ اس بات سے آپ نے یزید سے دردِ دل کا اظہار کیا کہ کتنا ظلم ہے کہ خود تیرے گھر کی عورتیں پردہ میں ہیں لیکن خاندان عصمت کی عورتیں بے پردہ ہیں۔ جناب زینبؑ نے اس سے یہ نہیں کہا کہ تمہاری عورتیں محل میں ہیں اور ہم اسیر ہو کر کھنڈر میں ہیں یا تیرے گھر کی عورتیں شکم سیر ہیں اور ہم قیدی بھوکے ہیں یہ سب کچھ نہیں کہا۔ بلکہ آپ نے صرف پردہ کی بات کو رکھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ حجاب کا مسئلہ ان کے نزدیک کتنا اہم ہے

یہی وجہ ہے کہ آپؑ اور آپؑ کے ہمراہ خواتین نے مشکلات کے باوجود اپنی عفت کو پامال ہونے نہیں دیا بلکہ حجاب کی محافظ بن گئیں، جس کو ان کے خطبات میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

لہذا حضرت زینب سلام اللہ علیہا حجاب اور پردہ داری کی محافظت میں بھی تمام خواتین عالم کے لئے ایک بہترین نمونہ ہیں کیونکہ اگر وہ عفت و پردہ داری، صبر و شکیبائی میں فاطمہ سلام اللہ علیہا نظر آتی ہیں تو ہمت و جرائت میں حیدر کرار دکھائی دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب آپؑ نے بازار کوفہ میں خطاب کیا تو ایسا لگا کہ میدان صفین میں حضرت علی علیہ السلام بول رہے ہیں اور جب شام کے دربار بے حیائی اور پردہ دری پر زبان کھولی، تو محسوس ہوا کہ پردہ کی محافظ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا خلیفہ وقت کے سامنے جرائت گفتار کا اظہار کرتی ہیں۔ آپ نے اپنی آخری عمر تک عفت و حیا، ایمان و عرفان کی حفاظت کا محکم و مستحکم اہتمام کیا۔

حضرت زینبؑ اور خاندان عصمت کی خواتین زنان عالم کے لئے نمونہ اور آئیڈیل بن گئیں اور دنیا کی خواتین کے لئے یہ پیغام چھوڑ گئیں کہ حجاب و عفت کو کسی بھی حال میں نہ چھوڑنا کیونکہ یہ ایک عظیم ترین وظیفہ شریعت اور امر الہی ہے لہذا دنیا کے ظالموں اور

---

[1] مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۳۴

جابروں سے ڈر کر اپنے حجاب کو بالائے طاق نہ رکھ دینا۔ بلکہ ہر دور میں حجاب کی محافظ بن جانا تاکہ اس کے ذریعہ معاشرہ برائیوں اور بے راہ رویوں سے محفوظ رہے۔

شیطانی سوچوں اور غرایز کے خلاف کربلا کی وارث کی حیثیت سے جناب زینبؑ کی زندگی اور طرز عمل دنیا کی تمام مسلم خواتین کے لیے مثالی نمونہ ہے۔ اسلام نے عورت کو جو بہترین تحفہ دیا ہے، وہ چادر ہے، جس کے ذریعے وہ بیمار دل مردوں کی نظروں سے خود کو اور سماج کو بھی بچا سکتی ہے، اور حضرت زینبؑ ایسے تحفے کی قدر جانتی ہیں، اس لیے اس کی حفاظت کے لیے مکمل تیار ہے۔ بد قسمتی سے آج اس الٰہی عطیہ کی طرف توجہ نہ کرتے ہوئے خواتین نے اپنے آپ کو سب کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے اور بعض منفعت خوروں نے عورتوں کو سامان بیچنے کا ذریعہ بنا کر عورتوں کی قدر و قیمت کو کم کر دیا ہے اور انہیں انسانیت اور کمال کے درجے سے پست کر کے خود فائدہ حاصل کیا۔ جس سے روز بروز ہمارے سماج میں بے حیائی اور عریان گری کو فروغ ملتا رہا ہے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لیے بہترین ذریعہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا جیسی شخصیت کے طرز زندگی کو اپنی زندگی میں شامل کر لے تاکہ عورت خود بھی محفوظ رہے اور دشمن کی سازشوں کو بھی اپنے کردار کے ذریعہ ناکام کر دے اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی حقیقی کنیزوں میں اپنا مقام حاصل کر لے۔

مدح زینب کبریٰؑ

(حماد اہل بیت محسن نقوی)

باتوں کو ترازو کی طرح تولنے والی　　بھائی کی شہادت کی گرہ کھولنے والی

تاریخ کی آنکھوں میں حیا گھولنے والی　　وہ فاتح خیبر کی طرح بولنے والی

اسلام کو روشن بصد اعزاز کیا ہے

عباس کے پرچم کو سرافراز کیا ہے

اسلام کا سرمایہ تسکین ہے زینبؑ　　ایمان کا سلجھا ہوا آئین ہے زینبؑ

شبیرؑ ہیں قرآن تو یاسین ہے زینبؑ　　حیدر کے خد و خال کی تزئین ہے زینبؑ

گلشن عصمت کی وہ معصوم کلی ہے

تطہیر میں زہراؑ ہے تو تیور میں علیؑ ہے

امام باقر علیہ السلام علماء اہل سنت کی نظر میں

نثار احمد

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام یکم رجب ۵۷ ہجری کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپؑ کے والد ماجد حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور مادر گرامی، فاطمہ بنت حسنؑ تھیں۔ لہذا آپ پہلے امام معصوم ہیں کہ جن کے والدین ہر دو فاطمی و علوی تھے۔ آپ کا مشہور لقب باقر ہے جسے حدیث لوح کے مطابق رسول ﷺ نے آپ کی ولادت سے پہلے آپ کو دیا ہے۔ ۹۵ ہجری میں اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد آپؑ امامت کے الہی منصب پر فائز ہوئے۔ آپ ۱۹ سال اور چند مہینے اس عظیم مقام پر اس امت کی امامت اور راہنمائی فرماتے رہے، اور آخر کار ۷ ذی الحجہ ۱۱۴ ہجری کو ہشام بن عبد الملک ملعون کے ہاتھوں شہید ہوئے اور جنت البقیع میں امام حسنؑ اور امام سجادؑ کے جوار میں دفن ہوئے۔

حضرت آیۃ اللہ العظمی مکارم شیرازی امام محمد باقر علیہ السلام کے متعلق باقر العلوم کے لقب سے ملقب ہونے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: بلاشبہ امام عالی مقام نے لقب باقر العلوم کو اپنے آپ کے لئے مخصوص کیا ہے کیونکہ آپ نے مختلف علوم کو واضح کیا ہے اور تمام علوم جیسے تفسیر، عقاید، فقہ اور اخلاق میں اسلامی نظریات کو بیان کیا ہے اور آپؑ نے اس سلسلہ میں اس قدر احادیث بیان کی ہیں کہ فقط محمد بن مسلم نے تیس ہزار حدیث، امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کی ہیں۔

مکتب امامیہ کے اکثر احادیث شریف جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں امام محمد باقر علیہ السلام ، امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام علی رضا علیہ السلام سے روایت کی گئی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ان تینوں ائمہ علیہم السلام کے عہد میں دشمنان اہلبیتؑ فشار نہایت کم تھا کیونکہ بنو امیہ و بنو عباس کے مابین جنگ چل رہی تھی اور ان اماموں نے رسول اسلام ﷺ کی احادیث کو اپنے اجداد کے طرق سے روایت کر کے ہم تک پہنچایں، اسی وجہ سے فقہ شیعہ میں اس قدر وسعت پائی جاتی ۔۔۔ کہ قیاس کی ضرورت لازم نہیں آتی ہے کیونکہ ہمارے لئے علم کا دروازہ وا ہے جبکہ دوسروں کے پاس ان علوم کا دروازہ مسدود ہے یہی وجہ ہے کہ وہ قیاس اور ظن میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

ہم شیعہ اہل تسنن کی جو کوئی بھی کتاب دیکھتے ہیں اس میں انہی دو اماموں کی احادیث سے روبرو ہوتے ہیں، ان دونوں اماموں نے اصول دین کی بنیادوں کو بہت ہی اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی شخصیت علمائے اہل سنت کی نظر میں

ہمارے ائمہ ھدی علیہم السلام اجمعین نہ فقط یہ کہ علمائے شیعہ کے نزدیک عظیم اور بلند مقام رکھتے ہیں، بلکہ علماء اہل تسنن کے نزدیک بھی اھل بیت اطہار علیہم السلام ایک خاص مقام و احترام رکھتے ہیں۔ یہاں ہم چند جید علماء اہل سنت کی نظر میں امام عالی مقام کا مقام و مرتبت ترتیب وار بیان کریں گے

عبد اللہ ابن عطاء:

عبد اللہ ابن عطاء: یہ صاحب حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ہم عصر بھی تھے اور آپ نے کہا ہے کہ: وَ عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عَطَاءٍ اَلْمَكِّيِّ: مَا رَأَيْتُ اَلْعُلَمَاءَ عِنْدَ أَحَدٍ قَطُّ أَصْغَرَ مِنْهُمْ عِنْدَ أَبِي جَعْفَرٍ، وَلَقَدْ رَأَيْتُ اَلْحَكَمَ بْنَ عُتَيْبَةَ مَعَ جَلاَلَتِهِ فِي اَلْقَوْمِ بَيْنَ يَدَيْهِ كَأَنَّهُ صَبِيٌّ بَيْنَ يَدَيْ مُعَلِّمِهِ۔ میں نے بزرگ علماء اور دانشمندوں کو ابو جعفرؑ کے سامنے بہت ہی عام انسانوں کی طرح پایا ہے، میں نے خود دیکھا ہے کہ حکم (ابن عتیبہ) ابو جعفر کے سامنے ایک چھوٹے سے شاگرد لگتا تھے۔

فرید الدین محمد عطار نیشاپوری:

عطار نیشاپوری مکتب اہل تسنن کے فلسفی، مصنف، سوانح نگار، متصوف ادیب اور بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ: وہ حجت خدا ہیں اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کے پوتے ہیں، اور حضرت جعفر صادقؑ آپ کے بیٹے ہیں جنکی کنیت ابو عبد اللہ ہے۔

امام باقر علیہ السلام علمی دقائق و لطائف کے عالم تھے اور انکی بہت سی کرامات بھی مشہور ہیں۔ آپؑ نے خداوند متعال کی راہ میں اپنی جان فدا کر دی تھی[1]۔

ابن ابی الحدید:

ابن ابی الحدید معتزلی، یہ اہل سنت کے بزرگ عالم تھے، انہوں نے امام باقر علیہ السلام کے بارے میں ایسا لکھا ہے: وهو سيد فقهاء الحجاز، ومنه ومن ابنه جعفر تعلم الناس الفقه، وهو الملقب بالباقر، باقر العلم، لقبه رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يخلق بعد، وبشر به، ووعد جابر بن عبد الله برؤيته، وقال: ستراه طفلاً، فإذا رأيته فأبلغه عني السلام، فعاش جابر حتى رآه، وقال له ما وصى به. وہ (امام باقرؑ) اہل حجاز کے بزرگ فقہاء میں سے تھے، ان سے اور ان کے بیٹے جعفر صادق علیہ السلام سے لوگوں نے علم فقہ سیکھا، ان کا لقب باقر

[1] کد کنی نیشابوری، فرید الدین ابو حامد محمد بن ابو بکر ابراہیم بن اسحاق عطار، تذکرۃ الاولیاء، ص ۵۵۸-۵۵۹،

تھا،وہ باقر علوم تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو یہ لقب عطاء کیا تھا،اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابی جابر انصاری کو خوشخبری دی تھی کہ تم میرے بیٹے محمد باقرؑ سے ملاقات کروگے اور میرے بیٹے کو بچپن میں ہی دیکھوگے،جب اس سے ملنا تو میرا اسلام پہنچانا۔ جابر کو خداوند نے اتنی زندگی عطا کی کہ انہوں نے ان (امام باقرؑ) سے ملاقات کی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلام ان کو پہنچایا[1]۔

محی الدین نووی:

محی الدین نووی اہل سنت کے شافعی مذہب کے عالم ہیں،وہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں:**محمد بن علی بن الحسین بن علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہم القرشی الھاشمی المدنی أبو جعفر المعروف بالباقر سمی بذلك لأنه بقر العلم ای شقه فعرف أصله وعلم خفیه...وھو تابعی جلیل إمام بارع مجمع علی جلالته معدود فی فقهاء المدینة وأئمتهم**۔ محمد بن علی بن حسین بن علی بن اَبی طالبؑ بنی ہاشم کے قبیلے قریش میں سے تھے،وہ اہل مدینہ میں سے تھے۔ انکی کنیت ابو جعفر تھی اور باقرؑ کے نام سے مشہور تھے،کیونکہ انھوں نے علم کو شگوفائی عطا کی اور وہ علم کے ظاہر و باطن سے آگاہ تھے۔۔۔۔وہ تابعین میں سے،ایک عظیم انسان اور علم میں ماہر امام تھے کہ جنکی عظمت اور جلالت پر علماء کا اجماع موجود ہے،کہ انکا شمار مدینہ کے فقہاء اور ائمہ میں سے ہوتا تھا۔

ابن خلکان (متوفی ۶۸۱ ہجری):

ابن خلکان شافعی نے امام باقر علیہ السلام کی عظمت کے بارے میں تحریر کیا ہے:**محمد الباقر أبو جعفر محمد بن زین العابدین علی بن الحسین بن علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہم أجمعین الملقب الباقر أحد الأئمة الاثنی عشر فی اعتقاد الإمامیة وھو والد جعفر الصادق. کان الباقر عالما سیدا کبیرا وإنما قیل له الباقر لأنه تبقر فی العلم أی توسع.** محمد باقر ابو جعفر و محمد بن زین العابدین علی بن حسین بن علی بن اَبی طالب علیہم السلام ان کا لقب باقر تھا،وہ شیعہ اعتقاد کے مطابق بارہ ائمہ میں سے ایک امام ہیں،اور جعفر صادق علیہ السلام کے والد ہیں۔ امام باقر علیہ السلام ایک عالم و بزرگوار انسان تھے،ان کو باقر کہا جاتا ہے،کیونکہ انہوں نے علم میں وسعت ایجاد کی۔

رازی:

رازی اہل سنت کے ادباء میں سے ہیں،اس نے لفظ ب ق ر کے ذیل میں لکھا ہے:**و التبقر التوسع فی العلم ومنه محمد الباقر لتبقره فی العلم**۔ تبقر یعنی علم میں وسعت ایجاد کرنا،اسی معنی میں محمد،کو باقر کہا جاتا ہے،کیونکہ انھوں نے مختلف علوم میں وسعت ایجاد کی تھی۔

---

[1] ابن اَبی الحدید المدائنی المعتزلی،ابو حامد عزالدین بن ہبۃ اللہ بن محمد بن محمد (متوفی ۶۵۵ھ)،شرح نہج البلاغۃ،ج ۱۵ ص ۱۶۴،تحقیق:محمد عبد الکریم النمری،ناشر:دار الکتب العلمیۃ-بیروت/لبنان،الطبعۃ:الاولی، ۱۴۱۸ھ- - ۱۹۹۸م۔

ابن تیمیہ حرانی نے امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں ایسے اعتراف کیا ہے:

ابو جعفر محمد بن علی من خیار اهل العلم والدین وقیل: انما سمی الباقر لانه بقر العلم. ابو جعفر محمد بن علی، وہ بہترین اہل علم و اہل دین میں سے تھے، کہا گیا ہے کہ انکا نام باقر رکھا گیا تھا، کیونکہ انھوں نے علم میں شگاف (وسعت) ایجاد کیا تھا۔

ذہبی:

ذہبی اہل سنت کے علماء کا ایک رکن سمجھا جاتا ہے، اس نے امام باقر علیہ السلام کا تعارف ایسے بیان کیا ہے: **الباقر أبو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن علی العلوی الفاطمی المدنی ولد زین العابدین... وکان أحد من جمع بین العلم والعمل والسؤدد والشرف والثقة والرزانة وکان أهل للخلافة ... وشهر أبو جعفر بالباقر من بقر العلم أی شقه فعرف اصله وخفیه ولقد کان أبو جعفر إماما مجتهدا تالیا لکتاب الله کبیر الشأن.**

باقرؑ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی علیہم السلام علوی و فاطمی اور اہل مدینہ تھے، وہ زین العابدین کے بیٹے تھے۔۔۔۔ اس زمانے میں فقط وہ ایک ایسے انسان تھے کہ جنھوں نے علم و عمل، بزرگی و شرافت اور عظمت و جلالت کو آپس میں اچھے طریقے سے جمع کیا۔ یعنی یہ ساری چیزیں ایک ہی وقت میں امام باقرؑ کی ذات میں پائی جاتی تھیں، ابو جعفر باقر کے نام و لقب سے مشہور تھے، کیونکہ انھوں نے علم میں وسعت ایجاد کی، اور وہ حقیقی علم کے ظاہر و باطن سے آگاہ تھے، اور ابو جعفر ایک امام مجتہد اور خداوند کی کتاب کی تلاوت کرنے والے تھے۔ ذہبی نے اپنی اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ جہاں انھوں نے تمام ائمہ کے ایک ایک کر کے نام ذکر کیے ہیں، وہاں پر امام باقر علیہ السلام کے نام مبارک کو ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: **و کذلك ابنه أبو جعفر الباقر سید امام فقیه یصلح للخلافة.** اور انکے بیٹے ابو جعفر باقر آقا، امام اور فقیہ تھے کہ جو خلیفہ بننے و خلافت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسی طرح ذہبی نے اپنی ایک دوسری کتاب تذکرۃ الحفاظ میں ایسے لکھا ہے: **أبو جعفر الباقر محمد بن علی بن الحسین الإمام الثبت الهاشمی العلوی المدنی أحد الأعلام... وکان سید بنی هاشم فی زمانه اشتهر بالباقر من قولهم بقر العلم یعنی شقه فعلم أصله وخفیه وقیل أنه کان یصلی فی الیوم واللیلة مائة وخمسین رکعة.** ابو جعفر باقر محمد بن علی بن حسین، امام، بنی ہاشم سے، علوی، اہل مدینہ اور بزرگان میں سے ایک تھے۔۔۔۔ وہ اپنے زمانے میں بنی ہاشم کے بزرگ تھے، جو باقر کے لقب سے مشہور تھے، اور علماء کے کلام کے مطابق: وہ علم میں شگاف اور وسعت ایجاد کرنے والے تھے، اور وہ علم کے ظاہر و باطن سے آگاہ تھے۔

حضرت امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام کے چند قرآنی احتجاجات

ظہور مہدی مولائی، مقیم حال: مہاجنگا، مڈگاسکر

تمام مسلمانوں کا یہ نہایت مضبوط اور اٹل عقید ہے کہ قرآن حکیم، خداوند عظیم و حکیم کا "کلام بلاغت نظام" ہے۔
لہذا اگر کوئی کسی بات، حادثہ یا واقعہ وغیرہ کے حقیقی ہونے یا نہ ہونے پر اس سے استدلال یا اس کی آیتوں کو دلیل یا شاھد کے طور پر پیش کرے تو ایک مسلمان کے لئے اسے ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ قرآن حکیم تمام اسلامی فرقوں کے درمیان ایک "معیار و میزان مشترک" کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس سے استدلال و احتجاج کرنا ان کے درمیان ایک نہایت مقبول و معتبر عمل کے عنوان سے باقاعدہ رائج رہا ہے۔ اور ظاہر ہے جس طرح اس سے استدلال و احتجاج کرنا تمام مسلمانوں کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل ہے اسی طرح جو عقائد، نظریات، حادثات یا واقعات وغیرہ قرآنی دلیلوں سے ثابت یا باطل ہو جائیں، ان کے لئے انھیں قبول کرنا بھی ایک ضروری امر ہے، بشرطیکہ اس سے استدلال و احتجاج کرنے والا عالم و عادل ہو اور مغالطہ سے کام نہ لے رہا ہو۔

بنابریں ہمارے ائمہ طاہرین علیہم السلام نے بہت سے مقامات پر اس عظیم و مشترک دینی و اسلامی منبع سے بہت سے سائلین اور منحرفین کے مقابلہ میں استدلال و احتجاج فرما کر احقاق حق اور ابطال باطل فرمایا ہے کہ جس کے بیشمار نمونے تاریخ و سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن سردست اس مقالہ کے عنوان کے تحت ہم فقط عبد صالح سرکار امام موسیٰ کاظم علیہ الصلوۃ والسلام کے بعض قرآنی احتجاجات کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں:

۱۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام سے پوچھا کہ کیا سرکار رسالتمآب ﷺ نے خداوند متعال کو دیکھا ہے؟
آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: ہاں، دیکھا ہے لیکن قلب و دل سے دیکھا ہے اور کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی ہے:
"ما کذب الفواد ما رای" یعنی قلب و دل نے اسے نہیں جھٹلایا، جو دیکھا۔[۲]

---

[۱] سورہ نجم، آیہ ۱۱

[۲] عروسی حویزی، تفسیر نور الثقلین، ج ۳، ص ۱۵۳۔

۲۔ عبد الغفار سمی نام کا ایک آدمی تھا جو خداوند سبحان کے سلسلہ میں یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت فرماتا ہے اور کہا کرتا تھا کہ "میں اللہ کی یہ توصیف خود اس کے قول "ثم دنیٰ فتدلیٰ"[1] کے تحت بیان کرتا ہوں۔

جب اس نے اپنے اس عقیدہ کا اظہار حجت خدا، فرزند رسول حضرت امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام کے حضور میں کیا تو آپ نے فرمایا: "دنی فتدلی" کا مطلب یہ ہے کہ جب پیغمبر اکرم اس مقام پر پہنچ گئے تو انھیں اللہ سے نزدیکی (معنوی قرب) حاصل ہوا، چونکہ خداوند متعال کسی بھی محل و مکان سے زائل نہیں ہے اور ہر جگہ حاضر ہے، اس کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا: "إِنَّ هَذِهِ لُغَةٌ فِي قُرَيْشٍ إِذَا أَرَادَ رَجُلٌ مِنْهُمْ أَنْ يَقُولَ قَدْ سَمِعْتُ يَقُولُ قَدْ تَدَلَّيْتُ وَإِنَّمَا التَّدَلِّي الْفَهْم"۔

حق یہ ہے کہ یہ لفظ قریش کے درمیان اس مقام پر استعمال کیا جاتا ہے کہ جب کوئی قرشی یہ کہنے کا ارادہ رکھتا ہو کہ میں نے سن لیا ہے تو وہ کہتا ہے "قد تدلّیتُ"، یعنی میں نے سمجھ لیا ہے، چونکہ "تدلیٰ" کا مطلب ہے فہم اور سمجھنا یعنی سنے ہوئے مطلب کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد قلب و ذہن کا اس سے نزدیک ہو جانا۔

۳۔ جب حمزہ ابن محمد نے امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام سے اللہ تعالی کے جسم و صورت رکھنے سے متعلق سوال کیا تو آپ نے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے قرآن حکیم کی اس آیۂ محکمہ "لیس کمثلہ شئ"[2] کو دلیل و حجت کے عنوان سے پیش کیا اور اس طرح نظریۂ تجسیم پر خط بطلان کھینچ دیا[3]

۴۔ سرکار امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام نظریہ "تجسیم" کی طرح نظریہ "جبر و اختیار" پر بھی خط بطلان کھینچتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کی تردید اور انسان کے اپنے افعال و اعمال پر اختیار رکھنے کی تائید میں قرآن حکیم کی آیہ محکمہ سے اس طرح استدلال و احتجاج فرماتے ہیں: اللہ نے انسانوں کو خلق فرمایا ہے اور وہ ان کے ذریعہ آئندہ انجام پانے والے افعال و اعمال سے آگاہ و باخبر ہے، اس نے انھیں امر و نہی فرمائی ہے، جہاں بھی اس نے امر فرمایا ہے، اسے انجام دینے کا راستہ ان کے لئے کھلا رکھا ہے اور جہاں بھی اس نے نہی فرمائی ہے، اسے ترک کرنے کا راستہ بھی ان کے لئے کھلا رکھا ہے، وہ انجام امر اور ترک نہی اذن الہی کی وجہ سے کرتے ہیں، اللہ نے کسی بھی مخلوق کو اپنی نافرمانی پر مجبور نہیں فرمایا ہے، بلکہ ان کا مختلف طریقوں سے امتحان لینے کا ارادہ فرمایا ہے، جیسا کہ سورہ ملک کی اس آیت "لیبلوکم ایکم احسن عملا" میں ارشاد ہوا ہے کہ (اللہ نے موت و حیات کو اس لئے خلق فرمایا ہے) تاکہ تمھارا امتحان لے کہ تم میں بہترین عمل کرنے والا کون ہے[5]

---

[1] ۔سورہ نجم، آیہ ۸۔

[2] ۔طبرسی، الاحتجاج، ج ۲، ص ۳۸۷۔

[3] ۔سورہ شوریٰ، آیہ ۱۱۔

[4] ۔شیخ صدوق، التوحید، ص ۹۷–۹۸۔

[5] طبرسی، احتجاج، ج ۲، ص ۳۸۷۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر آیات محکمات و متشابہات کی مختصر وضاحت پیش کر دی جائے:

الف؛ آیات محکمات: قرآن حکیم کی ان آیتوں کو کہا جاتا ہے کہ جن کے اندر ایسی صراحت و وضاحت پائی جاتی ہے کہ عربی زبان سے آگاہی رکھنے والا قاری و سامع آسانی کے ساتھ بغیر کسی شک و تردید کے ان کے معانی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

ب؛ آیات متشابہات: قرآن حکیم کی وہ آیتیں ہیں جن کے معانی میں ایسی صراحت و وضاحت نہیں پائی جاتی کہ جن کی طرف قاری یا سامع، آسانی سے بلا کسی تردید کے متوجہ ہو سکے، اس لئے اسے ان کے معنی و مقصود کو سمجھنے کے لئے "آیات محکمات" کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

جب ہم آیات متشابہات کو آیات محکمات کے سہارے سمجھتے ہیں تو پھر وہ بھی محکم ہو جاتی ہیں۔

یعنی آیات محکمات و متشابہات کے درمیان فرق یہ ہے کہ: آیات محکمات، بذات خود "محکم" ہوتی ہیں اور آیات متشابہات، آیات محکمات کے وسیلہ سے "محکم" ہوتی ہیں۔[1]

ہم نے یہ وضاحت یہاں اس لئے پیش کی ہے کہ امت مسلمہ کے درمیان "تجسیم"، "تفویض" اور "جبر مطلق" جیسے منحرف نظریات کے وجود میں آنے کی ایک بڑی وجہ آیات محکمات کو نظر انداز کر کے فقط آیات متشابہات سے تمسک کرنا ہے، جو ایک بھیانک غلطی اور قرآن و سنت کے برخلاف عمل ہے۔

اسی لئے ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ان منحرف نظریات کی تردید میں بہت سے مقامات پر ادلہ عقلی کے علاوہ قرآن حکیم کی آیات محکمات سے بھی استدلال و احتجاج فرمایا ہے۔

۵۔ ایک دن عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے حضرت امام کاظم علیہ الصلوۃ والسلام سے یہ سوال کیا کہ کس دلیل سے آپ اپنے کو رسول خدا کی نسل و ذریت کہتے ہیں، جب کہ رسول اللہ نے کوئی نسل و ذریت نہیں چھوڑی، چونکہ نسل، بیٹوں سے چلتی ہے نہ کہ بیٹیوں سے اور آپ ان کی بیٹی کی اولاد ہیں؟

امام علیہ الصلوۃ والسلام نے پہلے تو اس کا جواب دینے سے معذرت چاہی لیکن جب اس نے اصرار کیا کہ قرآن سے اس کی دلیل پیش کریں تو آپ نے دلیل کے طور پر اس آیہ کریمہ کی تلاوت فرمائی: "وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ. وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ"[2]۔

اور مذکورہ آیت کی تلاوت فرمانے کے بعد آپ نے ہارون سے پوچھا: عیسیٰ کے باپ کون تھے؟

---

[1] ۔مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ ج ۲، ص ۴۳۷۔

[2] انعام، ۸۴-۸۵

اس نے کہا: ان کے باپ نہیں تھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے اس آیہ کریمہ میں ان کی ماں مریم کی وجہ سے انھیں اولاد و ذریت ابراہیم میں شمار فرمایا ہے، پس جس طرح وہ اپنی ماں مریم کی وجہ سے ذریت ابراہیم ہیں، اسی طرح ہم اپنی ماں فاطمہ کی وجہ سے اولاد رسول خدا ہیں۔[1]

پھر آپ نے فرمایا: کیا ایک اور دلیل دوں؟

اس نے کہا: فرمائیے، تو آپ نے آیۂ مباہلہ کی تلاوت فرمائی: "فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ"[2]۔

اور اس کے بعد یوں گویا ہوئے: کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے، کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نصاریٰ نجران سے مباہلہ کے لئے رسولؐ اللہ، علیؑ، فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے علاوہ کسی کو لے گئے تھے۔

پس اس آیہ کریمہ میں "ابنائنا" یعنی فرزندان رسول سے مراد حسنؑ و حسینؑ ہیں، "نسائنا" سے مراد فاطمہ ہیں اور "انفسنا" سے مراد علیؑ ہیں۔

ہارون نے یہ محکم قرآنی دلائل سن کر کہا: احسنت یا موسیٰ۔[3]

آخر کلام میں خداوند متعال سے دعا ہے کہ ہم سب کو قرآن حکیم پڑھنے پڑھانے، سمجھنے سمجھانے اور اس کے تعلیمات و ہدایات پر عمل کرنے اور عمل کرانے کی توفیق عطا کرتے ہوئے اس مقدس و محترم کتاب کو مہجوریت سے جلد از جلد نجات عنایت فرمائے آمین

* * *

[1] اقتباس از احتجاج طبرسی، ج ۲، ص ۱۶۳ تا ۱۶۵۔

[2] سورہ آل عمران آیہ ۶۱

[3] اقتباس از احتجاج طبرسی، ج ۲، ص ۱۶۳ تا ۱۶۵۔

شیعوں کی راہنمائی میں

امام محمد تقی علیہ السلام کا سیاسی اور اجتماعی کردار

علی عباس حمیدی

شیعہ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور حکومت میں سخت ترین دباو کا شکار تھے۔ شیعہ تحریکیں مسلسل یکے بعد دیگرے اٹھتی تھیں اور حکومت کی جانب سے کچل دی جاتی تھیں۔

شیعہ ہونا بہت بڑا جرم بن چکا تھا جسکی سزا قید کر دینا، قتل کر دینا، تمام اموال کا ضبط کر لینا اور گھروں کو مسمار کر دینا جو حکومت کا قانونی حق بن چکا تھا۔ ایسے حالات میں ائمہ معصومین علیہم السلام اور شیعوں کے روابط مخفیانہ طور پر انجام پاتے تھے۔ لیکن امام موسی کاظم علیہ السلام اور امام رضا علیہ السلام کی سیاسی فعالیت کے نتیجے میں شیعہ ایک حد تک طاقتور بن گئے اور اس قابل ہو گئے کہ اپنے وجود کو غیروں سے منوا سکیں

اسی دور سے انکی تعداد بھی کافی حد تک بڑھنے لگی۔ شیعہ اب ایسے مرحلے تک پہنچ چکے تھے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی امامت کا برملا اظہار کر دیں یہ سیاسی تبدیلی اس حد تک قوی ہوئی کہ اب خلفاء بنی عباس اعلانیہ طور پر ان سے اپنی دشمنی کا اظہار کرنے سے کترانے لگے۔

دوسری جانب بنی عباس حالات پر قابو پانے کے لئے ائمہ معصومین علیہم السلام کو اپنے حال پر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کو اپنے قریب رکھیں تاکہ انکی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکیں۔ چنانچہ مامون عباسی نے امام علی رضا علیہ السلام کو مدینہ سے طوس آنے پر مجبور کر دیا۔ امام نے اسی چیز کو علویوں کے اجتماعی اثر و رسوخ میں اضافے کا باعث بنا دیا۔

امام محمد تقی علیہ السلام کے ماننے والے بغداد، مدائن، عراق اور مصر تک پھیل گئے خراسان اور رے کو شیعوں کی مرکزیت حاصل ہو گئی۔ شیعہ امام جواد علیہ السلام کے وکلاء کے ساتھ رابطہ برقرار کرنے کے علاوہ حج کے موقع پر خود امام علیہ السلام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے لگے۔ قم شیعوں کا سب سے بڑا اور اصلی مرکز بن گیا تھا۔ قم کے شیعوں نے بھی امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ براہ راست رابطہ برقرار کر رکھا تھا۔

دوسری طرف قم کے لوگ مامون عباسی کی حکومت کی مخالفت کا بھی اظہار کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مامون عباسی نے علی ابن ہشام کی سربراہی میں قم پر فوجی حملے کا حکم دے دیا لیکن اسے پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح فارس، اہواز، سیستان اور خراسان میں مختلف شیعہ گروہ وجود میں آئے جو امام جواد علیہ السلام سے مکمل رابطے میں تھے۔

مامون عباسی جو بنی عباس کا سب سے زیادہ چالاک اور دوراندیش حکمران تھا خود کو علم اور آزادی بیان کا حامی ظاہر کرتا تھا جسکا مقصد اقتدار پر اپنے قبضے کو باقی رکھنا اور ایسے حقائق کو مسخ کرنا تھا جو بنی عباس کی سیاسی بقا کیلئے خطرہ تھے۔

مامون عباسی امام محمد تقی علیہ السلام کے دور امامت میں حکم فرما تھا اور انکی زندگی کا بڑا حصہ مامون کے دور حکومت میں گزرا۔ مامون عباسی نے شیعہ تفکر پر مکمل غلبہ پانے کیلئے امام علی رضا علیہ السلام اور امام محمد تقی علیہ السلام کے دور امامت میں بہت سے اقدامات انجام دیئے۔ اس نے گذشتہ حکمرانوں کے رویے کے برعکس اپنے دور کے امام کے ساتھ نئے انداز سے پیش آنے کی کوشش کی اور انہیں اپنے زمانے کے نامور دانشور اور علماء حضرات کے ساتھ علمی مناظروں میں الجھائے رکھنے کی سعی لاحاصل کی تھی، اس کام سے اپنے زعم میں اسکی دونوں طرح جیت تھی وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر کسی طرح علمی میدان میں امام شکست سے دوچار ہوجائیں تو شیعوں کا دعوی باطل ہوجائے اور اگر کامیاب ہوجائیں تو اپنے تقرب کی دلیل کو قوت دے کر اپنی جھوٹی عقیدت جتانے میں کامیاب ہوجائے اس طرح مخالف شیعوں اور علویوں کو رام کرنے میں آسانی ہوجائے گی۔

اگرچہ مامون عباسی کا اصل مقصد تو امام رضا اور امام جواد علیہما السلام کی علمی شخصیت کو خدشہ دار کر کے شیعہ مذہب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہی تھا۔

مامون کا ایک اور حربہ درپردہ مامون عباسی داخلی طور پر شیعوں پر جاسوس مقرر کر دیتا تھا اور یہ کام وہ اپنی کنیزوں سے لیا کرتا تھا۔ وہ جسکی جاسوسی کرنا چاہتا تھا اسے اپنی ایک کنیز تحفے کے طور پر پیش کرتا تھا، یہی کنیز اسکے بارے میں تمام معلومات مامون عباسی تک پہنچاتی رہتی تھی۔

امام علی رضا علیہ السلام کے دور میں اس نے یہ کام اپنی بیٹی ام حبیبہ سے لیا۔ اور امام محمد تقی علیہ السلام کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کیلئے مامون عباسی نے انکی شادی اپنی ایک اور بیٹی ام الفضل سے کر دی اس شادی کی رسموں میں بھی اس نے شان امامت پر کئی حملے کئے مگر امام جواد کی ناراضگی نے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا۔

امام محمد تقی علیہ السلام کا وجود حاکم نظام کیلئے بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ مامون عباسی شیعوں کی بغاوت سے سخت خوفزدہ تھا لہذا انہیں اپنے ساتھ ملانے کیلئے مکر و فریب سے کام لیا۔ اس مقصد کیلئے اس نے امام علی رضا علیہ السلام کو عمر میں خود سے کہیں زیادہ بڑا ہونے کے باوجود اپنا ولیعہد بنایا اور انکے نام کا سکہ جاری کیا اور اپنی بیٹی سے انکی شادی کروائی۔

مامون نے امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی یہ رویہ اختیار کیا اور ۲۱۱ ھجری میں انہیں مدینہ سے بغداد بلوالیا تاکہ انکی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکے۔ اس وقت امام کی عمر ۱۶ سال رہی ہوگی۔ مامون عباسی دھمکیوں اور لالچ جیسے سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعے امام جواد علیہ السلام کو اپنا حامی بنانا چاہتا تھا۔

اسکے علاوہ اس کی کوشش تھی کہ شیعہ اس سے بدبین نہ ہونے پائیں، وہ امام علی رضا علیہ السلام کو شہید کرنے کا الزام بھی اپنے دامن سے دھو دینا چاہتا تھا۔ امام محمد تقی علیہ السلام اسکی توقعات کے برعکس اپنی تمام سرگرمیاں دقیق انداز میں انجام دیتے رہے۔ وہ حج کے بہانے بغداد سے خارج ہو کر مکہ آجاتے تھے اور واپسی پر کچھ عرصہ کیلئے مدینہ میں رہ جاتے تھے تاکہ مامون کی نظروں سے دور اپنی ذمہ داریاں انجام دے سکیں۔

مامون عباسی کے بعد اسکا بھائی معتصم برسر اقتدار آیا۔ اس نے مدینہ کے والی عبد الملک ابن زیاد کو لکھا کہ امام محمد تقی اور انکی اہلیہ ام الفضل کو بغداد بھجوادے۔ معتصم عباسی کے اقدامات کے باوجود امام محمد تقی علیہ السلام کی محبوبیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حکومت کیلئے جو چیز سب سے زیادہ ناگوار تھی وہ یہ کہ امام جواد علیہ السلام چھوٹی عمر کے باوجود سب کی توجہ کے مرکز بنتے جا رہے تھے اور دوست اور دشمن انکے علم اور فضیلت کے قائل ہو رہے تھے۔

جب امام جواد علیہ السلام بغداد کی گلیوں میں جاتے تھے تو سب لوگ آپکی زیارت کیلئے چھتوں اور اونچی جگہوں پر جمع ہو جاتے تھے۔

اسی طرح بنی عباس کے حکمرانوں کی سازشوں کے باوجود امام محمد تقی علیہ السلام کے اثر و رسوخ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ معتصم انتہائی پریشان تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ امام جواد علیہ السلام انتہائی عقلمندی سے اسکے تمام منصوبوں پر پانی پھیر رہے ہیں۔

سیستان کا رہنے والا بنی حنیفہ قبیلے کا ایک شخص کہتا ہے: میں ایک بار امام جواد علیہ السلام کے ساتھ حج پر گیا ہوا تھا۔ ایک دن ہم دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، معتصم کے دربار کے کچھ افراد بھی موجود تھے۔ میں نے امام جواد علیہ السلام سے کہا کہ ہمارا حکمران اہلبیت علیہم السلام سے محبت رکھنے والا شخص ہے، اس نے مجھ پر کچھ ٹیکس لگائے ہیں، آپ مجھے اسکے نام ایک خط لکھ دیں تاکہ میرے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرے۔

امام جواد علیہ السلام نے لکھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس خط کا حامل شخص تمہارے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے۔ تمہارے لئے فائدہ مند کام یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ نیکی سے پیش آو۔ وہ شخص کہتا ہے کہ جب میں سیستان آیا اور حکمران کو خط دیا تو اس نے وہ خط اپنی آنکھوں سے لگایا اور مجھ سے پوچھا کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟۔ میں نے کہا کہ آپ کے افراد نے مجھ پر بہت بھاری ٹیکس لگایا ہے، آپ لکھ دیں کہ یہ ٹیکس ختم کر دیا جائے۔ اس نے کہا کہ جب تک میں حکمران ہوں تم ٹیکس ادا نہ کرو۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام جواد علیہ السلام کا اثر و رسوخ کس حد تک تھا۔

امام محمد تقی علیہ السلام نے امامت کی بنیادوں کو مستحکم کیااور اہلبیت علیہم السلام کی موقعیت کو حفظ کیا آپؑ نے اپنے زمانے کے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں جیسے یحیی بن اکثم وغیرہ کے ساتھ مناظروں کے ذریعے اہلبیت علیہم السلام کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔

امام محمد تقی علیہ السلام کی کاوشوں کے نتیجہ میں لوگوں کے عقائد مستحکم ہوئے اور فقہی، سماجی بالیدگی نمایاں ہوئی شیعوں میں انسجام قائم ہوا جس کی وجہ سے آپؑ کے بعد شیعوں کے درمیان کوئی نیا فرقہ وجود میں نہیں آیا۔

حجاز، ایران، عراق اور مصر کے مختلف مقامات پر شیعہ بلاخوف زندگی بسر کرنے لگے تھے بلکہ پوری اسلامی سرزمین پر پھیل چکے تھے اکثر علاقوں کے شیعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کو خمس بھیجا کرتے تھے بیشتر علاقوں میں آپ کی جانب سے بہت سے وکیل بھی موجود تھے جو ان علاقوں میں آپ کے کاموں کو دیکھا کرتے تھے۔

اپنے زمانہ کے منحرف فرقوں کی تخریبی تحریکوں کو ناکام بنانا بھی آپ کی اہم ذمہ داری رہی اور آپ نے اپنے پیروکاروں کو ان سے بچائے رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کی۔

أَفضَلُ اعمالِ شیعتنا انتظارُ الفَرَج.

ہمارے شیعوں کا سب سے بہترین اعمال امام مھدی عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کا انتظار ہے۔

امام سجادؑ کی نگاہ میں صحت و تندرستی

سید پیغمبر عباس بشر نوگانوی

خداوند عالم نے ہمارے لئے واجب، حرام، مستحب، مکروہ اور مباح کی صورت میں جو احکام پہنچائے ہیں اُن میں اُخروی اجر کے علاوہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ہماری صحت و تندرستی کا راز پوشیدہ ہے ۔

انسان فطری طور پر تجمل پسند ہے لہٰذا اُس نے ظاہری آرائش پر تو بہت توجہ دی لیکن باطن کو آراستہ کرنے سے غافل ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ظاہری حسن و جمال پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا، جس سے انسانوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔

دوسری جانب اِنسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مشین کی طرح بن گیا ہے اور اُس کا روزمرہ کا معمولِ زندگی نہایت تھکا دینے والا اور پریشان کن ہو گیا ہے اس سے اُس کا ذہنی سکون ختم ہو کر طرح طرح کی نفسیاتی اور ذہنی بیماریاں وجود میں آگئیں ہیں، جس کا اثر یہ ہوا کہ انسان جسمانی اور اخلاقی طور پر بھی بیمار رہنے لگا اور دھیرے دھیرے اس کا اثر فیملی اور سماج پر پڑ رہا ہے۔

اس تحریر میں ہم امام حضرت علی ابن الحسین علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی میں انہی الجھنوں اور پریشانیوں کا علاج تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

سائیکاٹرسٹ کہتے ہیں کہ جب بھی انسان کے اندر اسٹریس بڑھتا ہے تو اس کا اثر براہ راست اس کے جسم پر پڑتا ہے اور ۷۵ فی صد تک جسمانی بیماریوں کا تعلق نفسیاتی امراض سے ہوتا ہے، اور جب اس حالت میں مایوسی اور ناامیدی بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انسان یا اپنے ایمان یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے!

انسان اگر نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس کا اثر جسم پر بھی پڑتا ہے اور جسمانی امراض میں مبتلا ہوتا ہے تو نفسیاتی بیماریاں بھی لگ جاتی ہیں اور وہ ان دونوں ہی صورتوں میں چڑچڑا ہو کر اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے

انسان نے علوم و فنون اور ٹیکنالوجی میں جتنی ترقی کی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس کے رہن سہن میں بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، جس کی وجہ سے نفسیاتی، جسمانی اور اخلاقی مشکلات و بیماریاں بھی وجود میں آئی ہیں۔

حالانکہ علم اور ٹیکنالوجی نے ان الجھنوں اور پریشانیوں کو دور کرنے کے بہت سارے علاج بھی دریافت کئے ہیں لیکن اس کے باوجود مذہب کی طرف رجوع اور اس کی پابندی منجملہ دعا، مناجات، وضو اور نماز نفسیاتی الجھنوں کو کم کرنے میں مدد ضرور کرتی ہے

اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دینداری انسان کو نفسیاتی بے چینی سے نکالنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے اور صحیح اعتقاد انسان کو ناامیدی جیسی جان لیوا بیماری سے بچالیتا ہے۔

الٰہی رہبروں نے ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ہمیں ایسے طریقے تعلیم فرمائے ہیں جن پر عمل کرتے ہوئے ہم ان اذیت ناک ذہنی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں اور اس طرح بہت ساری جسمانی بیماریوں سے نجات مل سکتی ہے۔

انسان میں اگر دین کی رمق بھی باقی ہوتی ہے تو وہ گناہ کرنے کے بعد ضرور پچھتاتا ہے اور اس کا ضمیر اسے ملامت بھی کرتا ہے، اب ایسی صورت میں اگر اُسے اپنی مغفرت، بخشش اور معاف کردیئے جانے کی امید نہ ہو تو وہ مایوسی کی طرف چلا جاتا ہے اور پھر وہ گناہوں کی دلدل میں دھنس جاتا ہے، گناہوں کی اسی دلدل سے نکالنے کے لئے عقیدۂ شفاعت بہترین کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ انسان اس عقیدے سے اپنی نجات کا امیدوار ہوجاتا ہے، نجات کی اسی سکون بھری امید کی طرف امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی ایک دعا میں اس طرح اشارہ فرمایا ہے: **وَ اغْفِرْ ذَنْبِي، وَ آمِنْ خَوْفَ نَفْسِي** ... [1] میرے گناہوں کو معاف کردے اور میرے نفس کے خوف کو سکون و اطمینان سے بدل دے۔۔۔ اگر مایوس انسان کے اندر اللہ سے امید پیدا کردی جائے تو وہ اپنی حالت میں سدھار پیدا کرسکتا ہے اور کسی حد تک مطمئن ہوسکتا ہے، ایک ناامید اور مایوس انسان کے اندر امید پیدا کرنے کے لئے فضل پروردگار سے بہتر کونسی چیز ہوسکتی ہے؟ امام علیہ السلام اللہ کے اسی فضل کی طرف اس طرح اشارہ فرماتے ہیں: **اَللّٰهُمَّ اِنَّمَا يَكْتَفِي الْمُكْتَفُوْنَ بِفَضْلِ قُوَّتِكَ، فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَ اكْفِنَا** ... [2] خدایا بے شک مطمئن ہونے والے تیری قوت ہی کے فضل و کرم سے مطمئن ہوتے ہیں، لہٰذا محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما اور ہمارے لئے کافی ہوجا۔۔۔

اس کے علاوہ اخلاقی بیماریاں بھی انسان کی زندگی پر برے اثرات ڈالتی ہیں، اِن اخلاقی بیماریوں میں لالچ، حسد، تعصب، ضد سر فہرست ہیں، صحیفہ سجادیہ کی آٹھویں دعا میں امام علیہ السلام نے ایسی بہت سی اخلاقی بیماریوں کی نشاندہی فرمائی ہے اور اللہ سے ان بیماریوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے، آپؑ فرماتے ہیں: (1) **اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَيَجَانِ الْحِرْصِ، وَ سَوْرَةِ الْغَضَبِ، وَ غَلَبَةِ الْحَسَدِ، وَ ضَعْفِ الصَّبْرِ، وَ قِلَّةِ الْقَنَاعَةِ، وَ شَكَاسَةِ الْخُلُقِ، وَ إِلْحَاحِ الشَّهْوَةِ، وَ مَلَكَةِ الْحَمِيَّةِ**۔۔۔۔ **اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ، وَ أَعِذْنِي مِنْ كُلِّ ذٰلِكَ بِرَحْمَتِكَ وَ جَمِيعَ الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ**۔ [3] خدایا میں تیری پناہ چاہتا ہوں لالچ کے ہیجان، غضب کی شدت، حسد کے غلبہ، صبر کی کمزوری، قناعت کی قلت، اخلاق کی ابتری، خواہشات کے دباؤ، تعصب کی حاکمیت

---

[1] صحیفۂ سجادیہ امام زین العابدینؑ، ترجمہ علامہ جوادی، دعا نمبر ۱۲، صفحہ ۱۱۴، ناشر کوثر پبلیکیشن نئی دہلی، پہلا ایڈیشن اکتوبر ۲۰۲۱

[2] صحیفۂ سجادیہ، دعا نمبر ۵، صفحہ ۸۴

[3] صحیفۂ سجادیہ، دعا نمبر ۸، صفحہ ۹۸-۱۰۰

ہوائے نفس کی اتباع، ہدایت کی مخالفت، غفلت کی نیند، تکلف پسندی، حق پر باطل کے مقدم کرنے، گناہوں پر اصرار کرنے، معصیت کو معمولی خیال کرنے، اطاعت کو تکلیف دہ تصور کرنے. دولت مندوں سے مقابلہ کرنے، غریبوں کو ذلیل کرنے، زیر دستوں کے ساتھ بد ترین سلوک کرنے، نیک برتاؤ کرنے والوں کا شکریہ ادا نہ کرنے. ظالم کی امداد کرنے، مظلوم کو نظر انداز کر دینے، غیر حق کا مطالبہ کرنے اور بلا سوچے سمجھے بات کہنے سے اور ہم تیری پناہ چاہتے ہیں اس بات سے کہ دل میں کسی کے ساتھ فریب کرنے کا ارادہ کریں یا اپنے اعمال میں خود پسندی کا شکار ہو جائیں یا لمبی لمبی امیدیں پیدا کریں، اور ہم اس بات سے بھی پناہ چاہتے ہیں کہ ہمارا باطن خراب ہو اور ہم گناہ صغیرہ کو حقیر خیال کریں یا شیطان ہم پر غالب آجائے یا زمانہ ہم کو مصائب میں مبتلا کر دے یا حاکم ہمیں پامال کر دے اور ہم اس بات سے بھی پناہ چاہتے ہیں کہ فضول خرچی اختیار کریں اور قناعت کو کھو بیٹھیں. اور اس بات سے پناہ چاہتے ہیں کہ دشمن ہمیں طعنے دے سکیں اور ہم اپنے جیبوں کے محتاج ہو جائیں یا ہماری معیشت شدت کا شکار ہو جائے یا موت بلا کسی تیاری کے آجائے. اور ہم تیری پناہ چاہتے ہیں عظیم حسرت، بڑی مصیبت، بد ترین بد بختی، برے انجام، ثواب سے محرومی، اور عذاب کے نازل ہونے سے. خدایا محمد و آل محمد ﷺ پر رحمت نازل فرما اور مجھے ان تمام بلاؤں سے پناہ دے دے، اپنی رحمت کے سہارے اور تمام مومنین و مومنات کو بھی پناہ دے دے اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

اس دعا میں امام علیہ السلام نے تقریباً ۴۴ ایسی بیماریوں کو ذکر فرمایا ہے جو سماج کو بری طرح متاثر کرتی ہیں اور ان بیماریوں کا علاج کسی میڈیسن سے نہیں ہو سکتا، جو لوگ اس طرح کی نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں سے جوجھ رہے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے مریضوں کو ڈاکٹر بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ جب تک مریض خود نہیں چاہے مرض ٹھیک نہیں ہو سکتا، اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ان رذائل کو خود چھوڑنا پڑتا ہے یہی ان کا بہترین علاج ہے جیسا کہ اس دعا میں تعلیم فرمایا گیا ہے، اس بیماری کے علاج کا طریقہ یہی ہے جو امام علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ انسان سچے دل سے توبہ کرلے اور پھر ان گناہوں کو نہ دہرائے، اور ساتھ ساتھ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا رہے کیونکہ یہ توفیق خداوند عالم ہی عطا فرماتا ہے کہ انسان اس قسم کی برائیوں سے دوری اختیار کر سکے۔ اس کے علاوہ اگر انسان کسی بھی وجہ سے جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو دعا اور دوا دونوں ہی اختیار کرنا چاہئے، جب امام علی علیہ السلام کے سر مبارک پر ضربت لگی تو آپ کسی بھی معصوم سے فرما سکتے تھے کہ زخم پر پھونک مار دیں لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہی فطری تقاضے اور طریقے تعلیم فرمائے جو خداوند عالم نے بشریت کے لئے رکھے ہیں اور آپ نے طبیب کو بلوایا تاکہ سر کے زخم کا علاج کرے، امام کا یہ عمل اُن لوگوں کے لئے بہت بڑا درس ہے جو بیماری کی حالت میں ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرتے اور آپ سے منسوب کسی درگاہ میں جاکر چلے پر بیٹھ جاتے ہیں!

ائمہ علیہم السلام نے ہمیں بیماری کی حالت میں دعائیں تعلیم فرما کر رہنمائی فرمائی ہے کہ دوا کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہئے، کیونکہ تمام ادویات اور ان کے اجزا کو خداوند عالم نے پیدا کیا ہے اور اسی نے ان میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ بیماری کو دور کر دیں۔

امام زین العابدین نے بھی بیماری کی حالت میں سکون پانے کے لئے دعا تعلیم فرمائی ہے، آپ علیہ السلام کی یہ دعا اُن لوگوں کے لئے بہترین درس ہے جو خداوند عالم کی پیدا کی ہوئی دواؤں پر تو اعتقاد رکھتے ہیں لیکن خداوند عالم کی عطا کی ہوئی تاثیر سے غافل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا نفس بہت کمزور ہے، تھوڑی سی بیماری اور پریشانی میں ہماری قوت برداشت جواب دے دیتی ہے اور خدا سے گلے شکوے کرنے لگتے ہیں اور یہ حالت تکلیف میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی ہے، اور اگر ہم بیماری میں دعا کرتے بھی ہیں تو مطالب پر توجہ نہیں کرتے، جب کہ بیماری سے مقابلہ کرنے اور شفا مانگنے کا صحیح طریقہ اس دعا میں موجود ہے جو امام زین العابدین علیہ السلام نے تعلیم فرمائی اور وہ دعا یہ ہے: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى مَا لَمْ اَزَلْ اَتَصَرَّفُ فِيْهِ مِنْ سَلَامَةِ بَدَنِيْ، وَ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى مَآ اَحْدَثْتَ بِيْ مِنْ عِلَّةٍ فِيْ جَسَدِيْ فَمَآ اَدْرِيْ يَآ اِلٰهِيْ! اَيُّ الْحَالَيْنِ اَحَقُّ بِالشُّكْرِ لَكَ؟ وَ اَيُّ الْوَقْتَيْنِ اَوْلٰى بِالْحَمْدِ لَكَ؟ ---- وَ اجْعَلْ مَخْرَجِيْ عَنْ عِلَّتِيْ اِلٰى عَفْوِكَ، وَ مُتَحَوَّلِيْ عَنْ صَرْعَتِيْ اِلٰى تَجَاوُزِكَ، وَ خَلَاصِيْ مِنْ كَرْبِيْ اِلٰى رَوْحِكَ، وَ سَلَامَتِيْ مِنْ هٰذِهِ الشِّدَّةِ اِلٰى فَرَجِكَ اِنَّكَ الْمُتَفَضِّلُ بِالْاِحْسَانِ، الْمُتَطَوِّلُ بِالْاِمْتِنَانِ، الْوَهَّابُ الْكَرِيْمُ، ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ. [1] خدایا تیرا شکر ہے اس سلامتی بدن پر جس میں ،میں ہمیشہ کروٹیں بدلتا رہتا ہوں اور تیرا شکر ہے اس بیماری پر بھی جو تو نے میرے جسم میں پیدا کر دی ہے کہ مجھے نہیں معلوم ہے کہ دونوں میں سے کونسی حالت زیادہ شکر ادا کرنے کی ہے اور دونوں میں کونسا وقت زیادہ حمد کرنے کا ہے. وہ صحت کا وقت جس میں تو پاکیزہ رزق کو خوشگوار بنا دیتا ہے اور مجھے اپنی مرضی اور اپنے فضل و کرم کو تلاش کرنے کا نشاط عنایت کرتا ہے اور اس اطاعت کی قوت فرماتا ہے جس کی توفیق عنایت فرمائی ہے. یا وہ بیماری کے لمحات جس سے میری آزمائش کرتا ہے اور وہ نعمتیں عطا فرماتا ہے جن سے خطاؤں کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور میں جن گناہوں میں ڈوب گیا ہوں ان سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور مجھے توبہ اختیار کرنے کی تنبیہ حاصل ہوتی ہے اور مجھے گناہوں کو ختم کرنے کے لئے قدیم نعمتوں کی یاد دہانی کرا دی جاتی ہے.

اور اس بیماری کے دوران کاتبان اعمال وہ پاکیزہ اعمال درج کرتے رہے نہیں نہ کسی دل نے سوچا تھا اور نہ کسی زبان پر آئے تھے اور نہ کسی ہاتھ نے اس کی زحمت برداشت کی تھی بلکہ یہ صرف تیرے فضل اور احسان کا نتیجہ تھا۔

تو خدایا اب محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما اور میری نظر میں ان چیزوں کو محبوب بنا دے جن کا تو نے فیصلہ کیا ہے اور ان مصیبتوں کو آسان بنا دے جو مجھ پر نازل کر دی ہیں، مجھے گزشتہ فتنوں سے پاکیزہ بنا دے اور میرے پرانے اعمال شر کو محو کر دے ،مجھے عافیت کی حلاوت عطا فرما اور مجھے سلامتی کی خنکی کا مزہ چکھا دے، میرے لئے اس بیماری سے نکل کر معافی تک جانے کا راستہ

---

[1] صحیفۂ سجادیہ دعا نمبر ۱۵، صفحہ ۱۲۷-۱۲۶

بنادے،اور مجھے اس تباہی سے نکال کر در گزر کی منزل تک پہنچادے اور اس کرب سے چھٹکارا دلا کر سکون تک پہنچادے اور اس شدت سے سلامتی کے ذریعہ اطمینان کی منزل تک پہنچادے، بے شک تو احسان سے فضل و کرم کرنے والا
اور بڑی عظیم نعمتیں عطا کرنے والا ہے تو بے حد عنایت کرنے والا بھی ہے اور کریم بھی ہے اوپھر صاحب جلال و اکرام بھی ہے
اس دعامیں بیمار انسان کو سب سے پہلے اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ صحت و سلامتی کے زمانے کی قدر کرے اور خدا کا شکر ادا کرے،اور اگر بیمار ہو جائے تب بھی خداوند عالم سے شکوے شکایتیں کرنے کے بجائے اس کا شکر ادا کرے،فطری طور پر ایسا کرنے سے سکون محسوس ہوگا۔
امام علیہ السلام کی اس دعا سے پھر ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بیماری میں انسان کی آزمائش کی جاتی ہے لہذا ہمیں اس سے گلے شکوے نہیں کرنے چاہئیں تاکہ اس آزمائش میں ناکام نہ ہو جائیں۔
دعامیں یہ بھی درس ہے کہ جب انسان بیمار ہوتا ہے تو خداوند عالم اس کے اجر میں اضافہ فرماتا ہے،یہ ایسی امید کی کرن ہے جس سے بیمار انسان کو بہت سکون محسوس ہوتا ہے۔
بہر حال!اگر بیماری کی حالت میں اس دعا کو سمجھ کر پڑھا جائے اور غور و فکر کیا جائے تو مریض کے لئے سکون و اطمینان کا باعث ہو سکتا ہے۔
خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ تمام مریضوں کو شفا عطا فرمائے اور بیماری کی حالت میں ائمہ معصومینؑ بالخصوص امام زین العابدینؑ کی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین

مدح باب الحوائج

حیدر علی محشر

کبھی ظاہر ہے عکسِ مصطفیٰ باب الحوائج میں
کبھی دیکھی ہے شکلِ مرتضیٰ باب الحوائج میں

درِ ابنِ علی سے اس قدر ملتا ہے دنیا کو
ہے ہر جانب سے فیض ہل اتی باب الحوائج میں

زمین کربلا پر روضہ عبّاس ہے لیکن
نظر آئی مکمل کربلا باب الحوائج میں

علمدار وفا کے عادت و اطوار کہتے ہیں
مجسم ہے دعائے فاطمہ باب الحوائج میں

درِ جنت یہ کہتا ہے درِ عباس تک آؤ
ہے بابِ خلد تک کا راستہ باب الحوائج میں

قلم قدرت کا تھا اور نورِ حق کی روشنائی تھی
ہوا تحریر قرآنِ وفا باب الحوائج میں

اُدھر پیروں میں دریا ہے اِدھر چلّو میں پانی ہے
سمٹ کر آگئی ہے علقمہ باب الحوائج میں

شجاعت، صبر، ہمت، حوصلہ، ایثار و قربانی
ملے گی مرتضیٰ کی ہر ادا باب الحوائج میں

سدا اہل من کی سن کر خود کو جھولے سے گرا ونگا
بنوگا اے چچا اب دوسرا باب الحوائج میں۔۔

درِ عباس پر حیدر کو محشر کا خیال آیا
شفاعت کا دکھا پھر راستہ باب الحوائج میں

عباس ابن علیؑ

عالمِ بشریت اور جہانِ ہستی کا اک چمکتا ہوا مہتاب !

حیدرؑ کی دعاؤں کا ثمر حضرت عباسؑ ہے طاقت حیدرؑ کا اثر حضرت عباسؑ

سید تقی عباس رضوی کلکتوی

۴ شعبان سنہ ۲۶ ہجری کو مدینۂ منورہ میں سلطان کربلا، شہنشاہ اقلیم وفا، باب الحوائج، قمر بنی ہاشم حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام کی آمد دراصل مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی دعاؤں کا ثمر ہے۔

آپ کی ذات گرامی عالم بشریت کے لئے محتاج تعارف نہیں ہے پوری دنیا وہ چاہے دوست ہو یا دشمن خاص کر عالم اسلام میں محبان و شیعیان اہل بیتؑ کی ہر ایک فرد آپؑ کے علم و فضل، زہد و تقوی، اطاعت و اتباع مولا، ایفائے عہد، دلیری، جرأت و شجاعت، صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ جیسے اعلیٰ انسانی اخلاق وصف کی قائل ہے۔ آپؑ کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ آپؑ پروردۂ آغوش امامت اور کاشانۂ عصمت و طہارت کے تربیت و فیض یافتہ ہیں آپ کے جامع صفات و کمالات پر ائمہ معصومین علیہم السلام کی مہر تصدیق ثبت ہے اور آپؑ رسالت و امامت کی محبت و عقیدت و احترام کا محور و مرکز ہیں۔

صفات اور فضیلتوں کی بنیاد پر آپؑ کے بہت سارے القاب و کنیات ہیں مگر ان میں جو سب سے مشہور ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں: علمدار حسینی، شہنشاہ اقلیم وفا، سقائے سکینہؑ، قمر بنی ہاشم، باب الحوائج، طیار، عبد صالح، کبش الکتیبہ، سپہ سالار، ابوالقاسم، ابوالقربۃ، ابوالفرجۃ اور ابوالفضل ہے ان القاب و کنیات میں سب سے زیادہ مشہور و معروف:

"قمر بنی ہاشم، ابوالفضل اور باب الحوائج" ہے اور اس کے چند وجوہات ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ آپؑ کو قمر بنی ہاشم کے لقب سے اس لئے پکارا جاتا ہے کہ آپؑ نہایت حسین و جمیل نورانی چہرہ، مضبوط بدن اور لمبے قد کے مالک تھے جو آپؑ کے کمال و جمال کی نشانیوں میں شمار ہوتا تھا روایت میں ہے کہ: **کان العباس وسیما جمیلا یرکب الفرس المطهم و رجلاه یخطان فی الارض و یقال له قمر بنی هاشم**۔ عباس اتنے خوبصورت اور حسین تھے کہ جب بلند قامت گھوڑے پر سوار ہوتے تو انکے پاؤں زمین پر خط دیتے تھے اور ان کو لوگ بنی ہاشم کا چاند کہتے تھے۔

آپؑ کی مشہور کنیت ابوالفضل اس لئے ہے کہ ابوالفضل کا معنی ہے فضیلتوں کا مالک (فضیلتوں کا باپ)، البتہ بعض نے یہ کہا ہے کہ جناب عباسؑ، لبابہ بنت عبید اللہ بن عباس بن عبد المطلب کے ساتھ چالیس سے ۴۵ ہجری قمری کے درمیان رشتۂ ازدواج

میں منسلک ہوئے اور ان سے دو بیٹے "فضل" اور "عبید اللہ" ہوئے جس کی وجہ سے آپؑ ابو الفضل کہلائے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ بنی ہاشم کے خاندان میں جس کا بھی نام عباس ہوتا تھا اسے ابو الفضل کہا جاتا تھا اسی لئے حضرت عباس ابن علیؑ کو بچپن میں بھی ابو الفضل سے ہی پکارا جاتا تھا۔ اور اسی قول کو زیادہ عرفیت بھی حاصل ہے۔ جیسا کہ بعد شہادت آپ پر لکھے ایک مرثیہ کے فقرات کچھ اس طرح ہیں: أَبَا الْفَضْلِ يَا مَنْ أَسَّسَ الْفَضْلَ وَالإِبَا أَبِي الْفَضْلُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ لَهُ أَبَا۔ اے ابو الفضل! اے ہر فضیلت و پاکیزگی کو قائم کرنے والے! کیا میرے لیے کوئی فضیلت اور فضل ہے جس کے آپ حامل نہ ہوں؟

حضرت عباس علیہ السلام کو "باب الحوائج" کے لقب سے اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ آپؑ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہتے اور ان کے دینی، سماجی اور سیاسی کاموں میں ہاتھ بٹاتے اور شہر مدینہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کی مدد میں پیش پیش رہتے اور یہی معمول، آپؑ کا امام حسینؑ کے زمانۂ امامت میں رہا کہ جب بھی کوئی امامؑ کے پاس آتا آپؑ اس کی حاجت روائی پر مامور کئے جاتے تھے جیسے مولا علیؑ رسول خدا ﷺ کے زمانے میں ہر امور پر مامور تھے اور آپؑ سے بغیر مشورہ لئے کوئی کام رسول خدا ﷺ نہیں کرتے تھے خاص کر مشکل گھڑی میں اسی طرح مولا عباسؑ جوانان جنت کے سرداروں کے مابین اہمیت و عظمت کے حامل تھے کہ بغیر آپؑ کے کوئی امر طے نہیں پاتا تھا خاص کر مشکلات میں دونوں بھائی مولا عباسؑ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نیز آپؑ کے جود و کرم جو ہر عام و خاص کے لیے پسند تھی اور اس صفت میں آپؑ لوگوں کے لئے نمونہ عمل بن گئے تھے۔ یہ خصوصیات اس بات کا سبب بنی کہ آپؑ باب الحوائج کے لقب سے ملقب ہوئے۔ کل بھی دنیا والے آپؑ کے فضل و کرم سے فیضیاب ہو رہی تھی اور آج بھی لوگ آپؑ کے توسط و توسل سے کسبِ فیض کر رہے ہیں!

علما کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی مشکلات میں انسان گرفتار ہو جائے جس سے نکلنا مشکل ہو رہا ہو تو مولا عباسؑ سے توسل اختیار کیا جائے اور بارگاہ خداوندی میں آپؑ کو وسیلہ بنا کر «يا كاشِفَ الكَرْبِ عنْ وَجهِ الحُسَين اِكْشِفْ كَرْبى بِحَقِّ أَخيكَ الحُسَين» کا ورد ۱۳۳ مرتبہ کیا جائے۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام سے عشق و محبت اور خاص عقیدت رکھنے والے افراد جناب عباسؑ کے ساتھ ایک خاص محبت و عقیدت اور ارادت رکھتے ہیں اور چودہ معصومینؑ کے بعد ان کے لیے ایک عظیم مقام و منزلت کے قائل ہیں بقول میر انیس اعلی اللہ مقامہ:

عباسؑ نام ور بھی عجب سج کا ہے جوان نازاں ہے جس کے دوشِ منور پہ خود نشان
حمزہؑ کا رعب صولت جعفرؑ علیؑ کی شان ہاشمؑ کا دل حسینؑ کا بازو، حسنؑ کی جان
کیوں کر نہ عشق ہوشہ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

آپؑ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اور ام البنین علیہا السلام (فاطمہ بنت حزام) کے بڑے صاحبزادے جس طرح آپؑ اپنی شجاعت و بہادری میں بے نظیر تھے اسی طرح آپ کے دیگر بھائیوں (جعفرؑ، عبد اللہؑ اور عثمانؑ) بھی مولا امامؑ حسین علیہ السلام کی رکاب میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے ہیں۔

حضرت عباسؑ کی نسل عبید اللہ اور ان کے بیٹے حسن سے چلی آپؑ کے بیٹے مشہور علویوں میں سے تھے اور ان میں سارے ہی عالم، شاعر، ادیب، قاضی، حاکم اور فقیہ تھے مثلا: جناب حسن کے ایک بیٹے عبید اللہ اور ان کے بیٹے عبد اللہ مدینہ اور مکہ میں قاضی تھے جن کے بارے میں علما و مؤرخین کہتے ہیں کہ "کان لسنا فصیحا شدید الدین عظیم الشجاعة" یہ زبردست فصاحت کے مالک اور دین میں بہت پختہ تھے اور میدان شجاعت کے شہسوار تھے۔ لوگوں کی نظر میں آپ کی بے انتہا عزت تھی۔ بعض کا کہنا ہے کہ ظالم حکومتوں کے ظلم کی وجہ سے حضرت عباسؑ کی نسل نے مختلف ملکوں کی طرف ہجرت کی اور اسی وجہ سے یہ نسل مکہ، مدینہ، مصر، بصرہ، یمن، سمرقند، طبرستان، اردن، حائز و میاط، کوفہ، قم (یمن) شیراز، آمل، آذربائیجان، حیرجان مراکش وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے مولا عباسؑ کا نام عباسؑ کیوں رکھا؟! کہتے ہیں: «سماه امیر المومنین علیه السلام بالعباس لعلمه بشجاعته و سطوته و عبوسته فی قتال الاعداء و فی مقابله الخصما» حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے مولا عباسؑ کا نام عباس اس لیے رکھا کیونکہ آپؑ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں حضرت عباس کی شجاعت، قدرت و صلابت کے بارے میں علم و آگاہی رکھتے تھے۔

حضرت ابو الفضل العباس علیہ السلام کے کردار کی عظمت و بلندی، امامؑ وقت کی محبت و معرفت، اطاعت و اتباع اور تعظیم و احترام میں ہی مضمر ہے اور اس کا پتہ اس وقت چلا ہے کہ جب ۲۸ رجب سن ۶۰ ہجری کو امام حسینؑ نے اپنے سفر کا قصد کیا ہے تو مدینہ اور اطراف مدینہ کے سارے لوگ کچھ نہ کچھ امام کی بارگاہ میں اپنے آراء و نظریات پیش کئے ہیں مگر ایک واحد شخصیت حضرت عباس علیہ السلام کی ہے جو سراپا امام وقت کی محبت و اطاعت اور فرمانبرداری سے ہماھنگ ہے۔ آپ کے وجود مبارک میں خدا، رسولؐ اور امامؑ کی تعلیمات کا رنگ نظر آتا ہے۔ اور یہی سیرت و کردار ہمیں مولائے متقیانؑ میں نظر آتا ہے کہ آپؑ نے کبھی کسی محاذ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اور ان کی پوری حیات طیبہ میں اپنے آرا و نظریات پیش نہیں کئے اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آپؑ سے جو بھی احادیث اور روایات حتی نہج البلاغہ جیسی عظیم کتاب میں جو فرمودات ملتے ہیں وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے بعد کے ہیں کیونکہ آپؑ اللہ کے سراپا مطیع و فرمانبردار بندے تھے۔ آپؑ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ: "اَنَا عَبدٌ مِن عَبِیدِ

مُحَمّدؐ" میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔ جو سیرت باپ کی تھی وہی سیرت بیٹے کی ہے وہ بھی وقت کے ہادی و امام کے مطیع یہ بھی اپنے وقت کے امام کے اطاعت گزار تھے۔

تصویر ہے یہ فاتحِ بدر و حنین کی　　شمشیر ہے خدا کی، سپر ہے حسینؑ کی

حضرت امام سجاد علیہ السلام نے باوجود اس کے کہ خود امام دو جہاں اور وقت کے تنہا جلیل القدر صاحب علم و فضل ہونے کے، بارہا مولا عباسؑ کو "نافذ البصیرہ" کے عظیم الفاظ سے یاد کیا ہے آنحضرتؑ مولا عباسؑ کو اپنے زمانے کے نہایت صاحب فہم و بصیرت کا مالک جانتے ہیں، اتنی عظمت کی حامل شخصیت ہونے کے باوجود کبھی عباس ابن علیؑ نے حضرت امام حسینؑ کے سامنے نہ زبان کھولی اور نہ کبھی اپنے فضل و کمالات پر نازاں ہوئے آپؑ نے کبھی بھی اپنے آپ کو اپنے بھائی امام حسنؑ مجتبیٰ کے ساتھ ۹ سال اور امام حسینؑ کے ساتھ ۱۱ سال یعنی تادم حیات رہے مگر کبھی خود کو ان کے برابر نہیں سمجھا اور ہمیشہ ان کو اپنا امام سمجھتے تھے اور خود ان کا مطیع اور فرماں بردار تھے۔ اور ہمیشہ اپنے بھائیوں کو «یابن رسول الله» یا «یا سیدی» اور اس جیسے دیگر الفاظ کے ذریعے پکارتے تھے۔

صادق آل محمدؐ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام، عباسؑ بن علیؑ کی عظمت و جلالت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: "چچا عباسؑ کامل بصیرت کے حامل تھے وہ بڑے ہی مدبر و دور اندیش تھے انہوں نے حق کی راہ میں بھائی کا ساتھ دیا اور جہاد میں مشغول رہے یہاں تک کہ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے آپ نے بڑا ہی کامیاب امتحان دیا اور بہترین عنوان سے اپنا حق ادا کر گئے۔

مبلغ اسلام، پاسبان دین و شریعت، مفسر قیام حسینؑ انسانی حقوق کے علمبردار حضرت امام زین العابدینؑ جو کہ کربلا میں حاضر تھے اور اپنے چاچا عباسؑ کی بے مثال و بے نظیر ایثار و فداکاری اور مجاہدت کو نہایت ہی نزدیک سے دیکھا اور لمس کیا تھا، انکی ان کی قربانی فداکاری، ایثار اور معنوی مقام کے بارے میں فرماتے ہیں: رَحِمَ اللهُ العبّاس، فَلَقَدْ آثَرَ، و أبلی، و فدی اخاہ بنفسه حتّی قطعت یداہ، فابدله الله (عزّ و جلّ) بهما جناحین یطیر بهما مع الملائکه فی الجنّه، کما جعل لجعفر بن ابی طالب (ع)، و انّ للعباس عند الله (تبارك و تعالی) منزله یغبطه بها جمیع الشّهداء یوم القیامه. یعنی: خدا میرے چاچا عباسؑ کو رحمت کرے کہ اپنے آپ کو اپنے بھائی پر فدا کیا یہاں تک کہ دونوں بازوں قلم ہوے اور اللہ تعالی نے ان دو ہاتھوں کے بدلے دو پر دیئے ہیں جن سے وہ جنت میں اڑتے ہیں جس طرح انکے چاچا جعفر بن ابیطالبؑ کو دو پر عنایت ہوے ہیں۔ بارگاہ الہی میں حضرت عباسؑ کا ایسا مقام اور ایسی فضیلت ہے کہ ہر شہید انکی آرزو کرتا ہے۔

آپؑ کے زیارتنامہ میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول یہ جملات اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ آپؑ خدا و رسولؐ اور امام کے کامل مطیع و فرمانبردار، ولایت مداری، دین و ملت، ملک و وطن، اہل و عیال، بھائی و بہن عزیز و اقارب خاص کر وقت کے امامؑ کی اطاعت و پیروی اور وفاداری میں اس مراتب پر فائز تھے کہ امام معصوم کے لسان صدق سے نکل ہوئے جملات آج بھی

آپ کی عظمت کے گواہ ہیں. جیسا کہ آپؑ کے زیارتنامہ میں ہم برابر یہ پڑھا کرتے ہیں: **السلام علیك ایها العبد الصالح المطیع لله ولرسوله ولامیر المومنین والحسن والحسین**... یعنی، تجھ پر سلام ہو اے اللہ کے صالح بندے، اے اللہ اور اس کے رسولؐ کے مطیع و فرماں بردار اور امیر المومنین، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کے حقیقی پیروکار۔ "**اشهد لك بالتسلیم والتصدیق والوفاء والنصیحة کلف النبی المرسل** "میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ اے عباس تم منزل تسلیم و تصدیق اور وفاء و نصیحت پر فائز ہو... **اشهد و اشهد الله انك مضیت علی ما مضی به البدریون**... ہم اور خدا گواہی دیتے ہیں کہ اے عباس! تم اس طرح تحفظ اسلام کے میدان میں گزر گئے جس طرح بدر والے گزرے ہیں۔ اسی طرح سے منجی عالم بشریت، چشم و چراغ خاندان نبوت و امامت و عصمت حضرت قائم آل محمدؐ حضرت امام مہدی عج اللہ تعالی فرجہ الشریف زیارت ناحیہ مقدسہ میں فرماتے ہیں: **السلام علی ابی الفضل العباس بن امیر المومنین المواسی اخاه بنفسه**" ابوالفضل العباس بن امیر المومنین پر سلام ہو جنہوں نے کربلا میں اپنے بھائی پر جان نثار کر دی۔ اور پانی کی طلب میں اپنے دونوں ہاتھ قربان کر دیئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولا عباسؑ کو یہ شرف و منزلت ان کے حسب و نسب سے نہیں بلکہ ان کے علم و ادب، فہم و فراست، دینی بصیرت، خدا، رسولؐ اور امام وقت کی کامل اتباع و اطاعت سے حاصل ہوئی ہے۔ آپ نے بچپن سے جوانی تک جو کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے اسے آج ہمیں اپنی جوان نسلوں میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات نہایت افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ ہماری قوم میں دو ایسی باعظمت شخصیتوں کو ہمارے خطبا، شعرا اور مقررین و ذاکرین نے اس طرح پیش کیا ہے کہ آج! قوم کا بیشتر طبقہ پہلی شخصیت حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو بیمار و ناتواں امام سے ہی جانتا اور یاد کرتا ہے حالانکہ امام سجاد علیہ السلام مکارم اخلاق اور ستم رسیدہ فقرا و تنگدست افراد کی دستگیری میں آپ کی نظیر نہیں ملتی!

یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ باپ کی شہادت کے وقت مصلحت خداوندی کے تحت وقتی طور پر بیمار ہوئے لیکن آپؑ کی یہ بیماری کربلا کی تحریک اور سماج کی اصلاح و تعمیر کے متعلق آپ کے فرائض کی انجام دہی میں حائل رکاوٹ نہیں بن سکے! آپؑ نے بعد کربلا ہر ممکن مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کربلا کے پیغام کو دنیا تک پہنچایا اور خطبات و تقاریر، درس و تدریس، دعا اور مناجات کے ذریعہ معارف الہی کی نشر و اشاعت کی، جس کا منہ بولتا ثبوت "رسالۃ الحقوق" اور "صحیفہ سجادیہ" نامی کتاب ہے جو آپؑ کے چاہنے والوں کے نزدیک "قرآن" اور "نہج البلاغہ" کے بعد اہم اور مقدس کتاب ہے۔

دوسری عظیم شخصیت مولاعباس علیہ السلام کی ہے جو ہمارے درمیان شجاعت و بہادری اور وفا تک ہی محدود سمجھی جاتی ہے حالانکہ بنظر غائر اگر آپؑ کی ذات ستودہ پر اچٹتی نظر ڈالی جائے تو آپؑ روحانی اقدار کے اعلیٰ نمونے پر فائز تھے۔علم و بصیرت، فہم و فراست، زہد و تقوی، عبادت و ریاضت سمیت انسانی خوبیوں اور اس کے تمام اعلیٰ صفات و کمالات کو دیکھا جائے تو ہر ایک خوبی و صفات آپؑ میں واضح طور پر موجود ہے۔

آپؑ ایسے عظیم پاک و طاہر اور صالح ماحول میں پروان چڑھے کہ جو شاذ و نادر ہی کسی انسان کو حاصل ہوتا ہے! آپ علیہ السلام نے اپنے بابا علی علیہ السلام کے زیرِ سایہ زندگی کی منزلوں کو طے کیا کہ جو اس کائنات میں علم و حکمت کا سرچشمہ اور عدل و انصاف کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ حسنؑ اور امام حسینؑ جیسے عظیم بھائیوں کے ساتھ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں ساتھ رہے۔

جناب امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ۱۴ چودہ سال علم و حکمت کے خزانوں سے ایسا مالامال کیا اور اس کے اندر ایسی عظیم عادات و اطوار اور فضائل و کمالات کی روح پھونکی کہ جن کی بدولت وہ دنیا کے سامنے اپنے بابا کی شبیہ کی صورت میں ابھر کر سامنے آئے۔ علی بن ابی طالبؑ سے انہوں نے فن سپہ گری، جنگی علوم، معنوی کمالات، مروجہ اسلامی علوم و معارف خصوصاً علم فقہ حاصل کئے! لہذا آپؑ نے فرمایا: «إن ولدی العباس ذَقّ العلم ذقّا» میرے بیٹے عباس! کو علم اسطرح ملا جیسے پرندہ اپنے بچے کو غذا دیتا ہے۔ کہنے والے نے کہا یہ مثال درست نہیں کہ جیسے ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو حضرت علیؑ نے فرمایا: ہرگز نہیں وہ اس لئے کہ ماں کھاتی کچھ ہے پلاتی کچھ ہے (یعنی اناج کھاکر دودھ پلانے سے چیز کی اصلیت میں تغیر و تبدل واقع ہوجاتا ہے) جبکہ پرندہ جو خود کھاتا ہے وہی من و من بچے کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔

علما کہتے ہیں کہ حضرت عباس بن علیؑ کی ذات ستودہ بچپن سے ہی علوم و معارفِ الہیہ سے آراستہ تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا! جس آغوش تربیت میں عباس ابن علیؑ پروان چڑھے ہوں وہ دنیا والوں کی رشد و ہدایت کے لئے منبع و سرچشمہ قرار پائی ہے۔ جس کا نورِ علم اس منبع نور سے متصل ہے جس کے نور ہی سے آسمان و زمین میں روشنی ہے اور جو تمام علم و حکمت کا باب اور حقیقی سرچشمہ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے بارے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی دین شناس، عالم، مُحدّث، فقیہ اور مجتہد میں سے ایک تھے۔ مثال کے طور پر علامہ مامقانی لکھتے ہیں: "حضرت ابوالفضل العباس علیہ السلام ائمہ معصومین علیہم السلام کی اولاد کے فقہاء میں سے تھے"۔ جیسا کہ بعض برجستہ علما و مجتہدین کرام نے لکھا ہے کہ:

«هو البحر من ای النواحی اتیته *** فلجته المعروف و الجود ساحله»؛

وہ ایسا بے پایاں سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، ایسا سمندر ہے جس کی موجیں نیک ہیں اور اس کا ساحل سخاوت و فیاضی سے لبریز ہے۔

یقیناً! بعد حسنین کریمین اولادِ علی ابن ابیطالب علیہ السلام میں حضرت عباس علیہ السلام کی شخصیت کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ: یہ ذات والاصفات علم و حکمت، فضل و کمال اور جود و کرم کا سرمدی دریا ہے۔

اگرچہ عباس ابن علیؑ امامت کے درجے پر فائز نہیں لیکن مقام و منزلت میں اتنے کم بھی نہیں تھے۔ آپؑ کی قدر و منزلت کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ: **وَإِنَّ لِلْعَبّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ تَبارَكَ وَتَعالى مَنْزِلَةٌ يَغبِطُهُ بِها جَميعَ الشُّهَداءِ يَوْمَ القِيامَةِ**۔ روز قیامت تمام شہداء حضرت عباس علیہ السلام کے مقام و منزلت پر رشک کریں گے۔

بقول شاعر

خوشبو ہے دو عالم میں تیری اے گُلِ چیدہ — کس منہ سے بیاں ہوں تیرے اوصافِ حمیدہ
سیرت ہے تیری جوہرِ آئینہ تہذیب — روشن تیرے جلووں سے جہانِ دل و دیدہ
مضمر تیری تقلید میں ہے عالم کی بھلائی — میرا یہی ایماں ہے، یہی میرا عقیدہ

تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ

یاد رہے! مولا عباس علیہ السلام کی رفعت شان اور عظمت مقام کی واحد وجہ معرفت خدا، معرفت رسولؐ اور زمانے کے امامؑ کی کامل اطاعت ہے۔ آپ میں موجود سارے نمایاں صفات و خصوصیات ای اطاعت و معرفت کے ثمرات ہیں لہذا شہنشائے وفا ،گل گلزار زہراؑ، نور چشم مرتضی، باب الحوائج، قمرِ بنی ہاشم حضرت عباسؑ کے چاہنے والوں کو چاہئیے کہ آپؑ کی سیرت و تعلیم کو اپنا دستور العمل قرار دیں، اور صادق آل محمد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس بات کو ملحوظ خاطر رکھیں کہ آپ نے مولا عباس علیہ السلام کے متعلق فرمایا : "**لعن الله من جعل حقك و ستخف بحرمتك**" اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے جس نے تمہارے حق کی پرواہ نہیں کی اور تمہارا احترام نہیں کیا۔

در حقیقت چھٹے امام علیہ السلام کے نقطہ نظر سے جو لوگ حضرت عباس علیہ السلام کو نہیں جانتے اور ان کی کامل معرفت و شناخت نہیں رکھتے وہ بھی ان کے قاتلوں کے ساتھ ملعون و مردود ہیں۔

کیونکہ حضرت امام مہدی علیہ السلام حضرت عباس جیسے اصحاب چاہتے ہیں اور "عباسؑ" بننے کے لیے پہلے انہیں جاننا پہچاننا اور ان کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے۔

لہذا مولا عباس علیہ السلام کو جاننا اور ان جیسا بننے کی کوشش کرنا ہم سب شیعوں اور ان لوگوں پر واجب ہے جو ظہور کے منتظر ہیں اس لئے کہ معرفت امام زمانہؑ کا حصول انہی باعظمت شخصیتوں کی معرفت سے وابستہ ہے۔

یاد رکھیں! اگر ہماری عملی حالت مولا کی سیرت و تعلیمات کے مطابق نہیں تو یا عباس یا عباس کے فلک شگاف نعروں سے کچھ نہیں ہونے والا جب تک ہم اپنے وقت کے امام، امام عصرؑ کی محبت، اطاعت، اتباع اور تعظیم و تکریم کا صرف قولاً دعویٰ اور عملاً ان کی تعلیمات سے دور اور بے بہرہ رہیں گے نہ ہمیں ان کی معرفت حاصل ہو گی اور نہ ہی ہم اپنے مقصد حیات یا اس سعادت تک جو خداوند عالم نے ہمارے لئے محفوظ کر رکھی ہے اس تک پہنچ سکتے ہیں۔

اگر ان سے کچھ بھی عقیدت ہے تم کو، تو اپنا وطیرہ بدلنا پڑے گا...

نفاقِ زبان و عمل سے نکل کر، صداقت کے سانچے میں ڈھلنا پڑے گا...

ہمیں خاص کر ہمارے جوانوں کو چاہئیے کہ دور حاضر میں اپنے دین و ایمان اور یقین کی سنگلاخ وادیوں کو حضرت ابوالفضل العباسؑ کی شناخت و معرفت سے آبیاری کریں اور اگر سن سکیں تو سنیں کہ اس دور پُر بلا میں ہم سے روحِ مولا عباسؑ خراجِ معرفت مولا کی طالب ہے کہ تم بھی خدا، رسولؐ اور اپنے وقت کے امامؑ کی اطاعت و اتباع اور عہدِ وفا کی صلابت میں فولاد و آہن، کرم کی لطافت میں رحمت مکمل بن کر جینا سیکھو، اپنے اندر حصول علم، حکمت و دانائی کی قوت ارادے کی پختگی، مضبوطی اور استقلال پیدا کرو اور جو تم میں قول و عمل کی دورنگی ہے اس سے باز رہو۔

یہ ذوقِ اطاعت سے خالی عقیدت، عقیدت نہیں صرف بازی گری ہے، جو ایثار و اقدام سے جی چرائے، محبت نہیں، صرف بازی گری ہے....

حضرت امام زمانہ علیہ السلام:

«السلام علی ابی الفضل العباس المواسی اخاہ بنفسہ»

میرا اسلام ہو ابوالفضل العباسؑ پر کہ جنہوں نے اپنے بھائی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے ایثار اور وفاداری کا اعلیٰ مظاہرہ کیا۔ (زیارت ناحیہ)

جناب علی اکبر علیہ السلام اور ہماری جوان نسل

سید نجیب الحسن زیدی

آج کے اس پر آشوب دور میں جہاں ہر طرف نفسانفسی کا عالم ہے ہر ایک خود میں مگن ہے ایک جوان ایسے آئیڈیل کی تلاش میں حیران و سرگردان ہے جسے اپنی زندگی کا آئینہ بنا کر کامیابی کی بلندیوں کو طے کرتا ہوا اپنی منزل مطلوب تک پہنچ جائے ایسے میں ضروری ہے کہ ہم ان شخصیتوں کے کردار و افکار کو جوانوں کے سامنے پیش کریں جو ہر اعتبار سے ایک مکمل آئیڈیل ہیں جناب علی اکبر علیہ السلام کی ذات بابرکت انہیں ہستیوں میں سے ایک ہے جسے اس پر محن دور میں جوانوں کے آئیڈیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ولادت جناب علی اکبر علیہ السلام اور روز جوان:

۱۱شعبان المعظم وہ تاریخ ہے جب امام حسین علیہ السلام کی آغوش مبارک میں علی اکبر جیسا فرزند آیا، جس نے دنیا میں محض اٹھارہ بہاریں گزاریں اور اپنی پوری زندگی اپنے بابا کے مقصد پر یوں قربان کر دی کہ آج کے جوانوں کے لئے نمونہ بن گیا اور اسی بنیاد پر ۱۱شعبان کی تاریخ کو اسلامی دنیا خاص کر اسلامی جمہوریہ ایران میں علی اکبر علیہ السلام سے منسوب کرتے ہوئے "یوم جوان" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوں تو ہر دن ہی جوانوں کا ہے کہ ان کے وجود میں حرکت ہوتی ہے، شادابی و فرحت سے انکا وجود سرشار ہوتا ہے اور ہر آنے والے دن کو وہ اپنی توانائیوں کی بنیاد پر یادگار بنا دیتے ہیں لیکن شعبان کی ۱۱تاریخ اس لئے اہم ہے کہ اس جوان کی ولادت سے منسوب جس نے اپنی جوانی کو آئینہ بندگی بنا دیا ایسا آئینہ جو رہتی دنیا تک لوگوں کو منزل کی نشاندہی کرتا رہے گا،

چنانچہ روز جوان جہاں جوانوں کی اہمیت کو بیان کرتا ہے، وہیں علی اکبر جیسے جوان کی یاد بھی دلاتا ہے جس نے اپنی جوانی دین پر لٹا دی اور ہر شریف النفس جوان کے دل کی دھڑکن بن گیا، اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ شام میں حق و باطل کے درمیان سجے معرکہ میں جوانوں کا جوش و ولولہ کیا ہے؟ فلسطین و غزہ میں کس طرح وہاں کے جوان ظالمین کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں، مزاحمتی محاذ میں کس طرح جوانوں نے اپنے عزم و حوصلہ سے عالمی سامراج کی نیندیں اڑا دی ہیں ان جوانوں کے عزم و انکی ہمت کو ہمارا اسلام، جو غزہ و لبنان میں چاروں طرف سے دشمنوں سے گھر کر بھی بساط حریت پر ڈٹے ہوئے ہیں اور دشمن تمام تر طاقت کے استعمال کے بعد بھی انہیں راہ حقانیت و شہادت سے ہلانے میں ناکام ہے ۔

علی اکبر علیہ السلام کی راہ پر چلتے ہوئے اپنی جوانی کو راہ اسلام پر لٹا دینے والے ان جوانوں کو سلام، جنہوں نے دنیا کی زرق برق کو ترک کر کے دفاع حرم زینب سلام اللہ علیہا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا، یہی وجہ ہے کہ شہداء حرم بی بی زینب سلام اللہ علیہا کی ایک بڑی تعداد ہیں ان جوانوں پر مشتمل نظر آتی ہے جنکا سن جناب علی اکبر علیہ السلام کے برابر ہے یقیناً کل اگر جناب علی اکبر علیہ السلام نے حقانیت کی راہ پر مر مٹ کر امر ہو جانے کا سبق نہ دیا ہوتا تو آج یہ روح پرور سماں نہ ہوتا، جو ہم شام و عراق کے میدانہائے جنگ میں دیکھتے آئے اور آج لبنان و فلسطین میں نظر آرہا ہے ۔ اور ہم آج مختلف علاقوں میں ان جوانوں کے متحرک کردار کی صورت دیکھ رہے ہیں جو ہر منزل پر آواز دے رہے ہیں کہ انسانیت کی خدمت کرنے کا طریقہ ہم نے علی اکبر سے سیکھا ہے لہذا ہمیں موت کا خوف نہیں ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ہم راہ حق پر گامزن ہیں۔۔۔

ہمارا کروڑوں سلام و درود حسین ابن علی علیہ السلام کے اس جوان بیٹے علی اکبر علیہ السلام پر جس نے "**اولسنا علی الحق**" کہہ کر ہمارے جوانوں کو سمجھا دیا کہ تم اگر حق پر ہو تو پرواہ نہیں ہونی چاہیئے کہ تم موت پر جا پڑو یا موت تم پر آپڑے۔ آج جہاں ایک طرف جوانوں سے منسوب اس دن میں ذکر و یاد علی اکبر سزاوار ہے، وہیں بہت مناسب ہے کہ ہم اپنے سماج اور معاشرہ میں غور کریں کہ جوانوں کے مسائل کیا ہیں اور انکی دشواریاں کیا ہیں؟

جوانوں کے مسائل اور انکو درپیش چیلنجز:

یقیناً موجودہ دور میں ہمارے جوانوں کے ساتھ بڑی دشواریاں ہیں، انہیں نہیں معلوم وہ کس طرف جائیں کہیں اخباریت و ملنگیت کا بازار سجا نظر آتا ہے، کہیں غالیوں کا شور شرابا ہے تو کہیں تصوف و طریقت کی باتیں ہیں، کیا ایسے میں ضروری نہیں کہ ہم اپنی جوان نسل پر توجہ دیں کہ وہ کہاں جارہی ہے؟

کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ آج ہمارے جوان سرگردان و حیران ہیں، کہیں وہ کسی پیر سے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈتے نظر آتے ہیں، کہیں کسی خود ساختہ صوفی و عارف کے جال میں پھنسے نظر آتے ہیں اور ان سب سے بچ بھی جائیں تو مغربی تہذیب کا غول پیکر دیو انہیں نگل لینے کے درپے نظر آتا ہے، وہ دور جو کامیابی کا دور ہوتا ہے اگر اس دور میں کوئی جوان منحرف ہو جائے تو پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ جوانی زندگی کا ایک ایسا مرحلہ ہے کہ جس میں انسان کے پاس قوت، قدرت اور نشاط و فرحت سبھی۔ چیزوں کی فراوانی ہوتی ہے، خود جوانی کو طاقت اور اُمید کا سرچشمہ بیان کیا گیا ہے۔ جوان کے اندر جذبہ و ارادہ ہوتا ہے، سب کچھ کر گزرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، بھرپور توانائیوں اور جرات کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنے کا ہنر ہوتا ہے۔ اب ایسے میں تمام تر توانائیاں اگر صحیح سمت و صحیح ڈائریکشن نہ ملنے کی بنا پر تباہی کی طرف چلی جائیں اور جوانی کا جوش و جذبہ تعمیر کی بجائے تخریب پر لگ جائے تو انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ کتنی خرابی معاشرہ میں پھیل سکتی ہے۔

مقام افسوس:

کیا یہ مقام افسوس نہیں کہ جن جوانوں کا نمونہ عمل و آئیڈیل جناب علی اکبر و جناب قاسم کو ہونا چاہیئے تھا وہ جوان آج اپنا آئیڈل مغربی سراب میں تلاش کر رہے ہیں، یہ مغرب کی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں جبکہ مغرب کی کھوکھلی تہذیب کا اژدھا جو بھی سامنے آئے اسے نگل رہا ہے، اقدار ہوں تو وہ نہیں بچتے، رشتوں کا تقدس ہو تو وہ نہیں بچتا، انسانی شرافت و کرامت کی تو بات ہی کیا، آج ہماری نئی نسل جس مغرب کے پیچھے بھاگ رہی ہے وہاں کے سمجھدار باسی تو خود اپنے رہن سہن سے پریشان ہیں۔ آج روز روشن کی طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ مغرب نے صرف اور صرف معاشی ترقی پر دھیان دیا اور اپنی نوجوان نسل اور معاشرے کو معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے پوری طرح سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مغربی معاشرہ تمام اخلاقی اقدار اور انسانی سعادت مندی کے آثار کھو چکا ہے، مادیت کی چکاچوند نے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے لیکن افسوس ہماری نوجوان نسل اب اسی فرسودہ تہذیب و ثقافت کو روشن خیالی، ترقی پسندی اور عظمت سمجھنے لگی ہے جبکہ مغربی تہذیب کا جس نے بھی ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا ہو وہ اقبال کی صورت کہتا نظر آئیگا:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

یہ جو آپ روز مغرب کے سلسلہ میں سنتے رہتے ہیں، فلاں جوان نے خودکشی کی اور اپنی خودکشی کے مناظر کو فیس بک پر لائیو ٹیلی کاسٹ کیا، یا پھر ایک جوان نے اپنے سارے بہن بھائیوں کو ایک ہال میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا اور خود کو بھی مار لیا، یا پھر کسی جوان نے اپنے اسلحے سے اپنے کلاس روم کے بچوں کو خاک و خون میں غلطاں کر دیا، یہ مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کی وہ علامتیں ہیں جن کے لئے اقبال بہت پہلے کہہ گئے تھے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی۔ جو شاخ نازک پر آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کیا یہ حیف و افسوس کی جگہ نہیں کہ وہ تہذیب جو خودکشی کے دہانے پر ہو ہمارے یہاں اس کی تقلید ہو رہی ہے؟۔۔۔ اور ہمارا جوان مغربی کلچر کے پیچھے پاگلوں کی طرح گھوم رہا ہے۔؟

آج ہمارے تعلیمی نصاب، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر غیر دینی عناصر اثر انداز ہیں اور وہ غلط، فاسد اور اخلاق سوز مفاہیم اور مناظر کو اس قدر دلچسپ، جاذب النظر اور قابل تقلید بنا کر پیش کرتے ہیں کہ نئی نسل کو ان کی تقلید کے بارے میں کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ خود اس غیر اسلامی مغربی ثقافت اور تہذیب کو پسند کرنے لگتی ہے اور اسی کو جدید، دلچسپ، قابل عمل اور اعلیٰ تہذیب و ثقافت سمجھ کر تقلید کرتی ہے۔ نئی نسل کو اس ثقافتی یرغمالی سے بچانا یقینا تمام صاحبان دین و دانش اور وارثان انبیاء علیہم السلام کی اولین ذمہ داری ہے۔ ان غیر دینی عناصر کو جدید اور موثر ذرائع سے ہی شکست دے کر آئندہ نسل کو بچایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے ہر ایک کو اپنی بساط کے مطابق قیام کرنا چاہیئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلم ممالک میں حکومتی سطح پر ایسے اقدامات اٹھائے

جائیں جو نہ صرف اسلامی معاشرے کو مغربی ثقافت کی یلغار سے محفوظ رکھیں بلکہ نوجوان نسل کی بہتری کے لئے صحت مند سرگرمیاں فراہم کی جائیں اور اسلامی ماحول میں رہتے ہوئے ایک مسلمان نوجوان کو تفریح کے تمام مواقع فراہم کئے جائیں، آج جبکہ عریانیت چہار سو اپنے جالوں کو بچھائے، جوان نسل کو کھو کھلا کرنے کے درپہ ہے اور مغربی کلچر بری طرح انہیں تباہ کر رہا ہے ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ اپنے جوانوں اور بچوں کی تربیّت قرآن و سنّت کے سائے میں کریں، انہیں اسلامی معارف سکھائیں تاکہ ہماری یہ نئ نسل مستقبل میں کچھ کر سکنے کے قابل ہو سکے۔

لہذا ملّت اسلامیہ کے فرد فرد کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ امّت مسلمہ کے روشن مستقبل کی خاطر اپنی سب سے زیادہ توجہ نئ نسل کی تعلیم و تربیّت پر مرکوز کریں کہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں، "جوان کا دل خالی زمین کی مانند ہے۔ آپ اس میں جو بات بھی ڈالیں وہ قبول کرے گا، پس اُسے ادب سکھائیں، اس سے پہلے کہ اس کا دل سخت ہو جائے"[1]۔ اس لئے کہ ایک نیک، صالح، قرآنی معاشرے کا قیام پاکیزہ اور دیندار جوانوں کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ نکاح سے لے کر ولادت تک اور ولادت سے لے کر بلوغ تک کے مراحل میں لمحہ بہ لمحہ قرآن و سنّت کا دامن تھامے رکھیں تاکہ ہمارا مستقبل تیرہ و تار ہونے سے بچ سکے۔

ایک نوجوان قلمکار نے کیا ہی خوب بات کہی ہے: "اسلام آباو اجداد کی اندھی تقلید سے پھیلنے والا جامد نظام حیات نہیں، بلکہ تحقیق و تجربے کی بنیاد پر پھیلتی ہوئی ارتقاءِ انسانیت کی علمی و فکری، تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و اجتماعی تحریک کا نام ہے۔ اس ہمہ جہتی تحریک کی نشو و نما میں جہاں انبیاء کرام کے علم و فضل، آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے عرفان امامت اور علماء کرام کی جد و جہد کا عمل دخل ہے، وہیں پر اسلامی جوانوں کے خون کے نذرانے بھی تاریخ اسلام کے ماتھے کا جھومر ہیں دنیاوی معاملات کی انجام دہی آج جوانوں کی توانائیوں پر منحصر ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں اور فکٹریوں میں جوان ہی کام کرتے نظر آتے ہیں انہیں پر بڑی بڑی کمپنیاں سرمایہ کاری کرتی ہیں کسی بوڑھے پر کوئی انوسومنٹ نہیں کرتا جبکہ اسلام میں بھی جوانی ہی کی عبادت کو بہترین عبادت کہا گیا ہے۔ بقول معروف "در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبری است" جوانی میں توبہ و خدا کی طرف بازگشت کو شیوہ پیغمبرانہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کل اور آج کے زمانے کا فرق:

کچھ لوگ بجائے اس کے کہ جوانوں کی رہنمائی کریں ان کو درپیش چیلنجز کا جواب دیں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم تو اپنی جوانی کے دور میں اتنے آزاد خیال نہ تھے، ہم نے بھی جوانی کا دور دیکھا ہے ہم تو ایسے لاابالی نہ تھے، ہم تو اتنے غیر ذمہ دار نہ تھے، آج کے جوانوں سے تو اللہ کی توبہ، اس طرح کی باتیں جو ہمارے بزرگ کرتے ہیں تو انہیں ذرا اپنا دور بھی دیکھنا چاہیئے، انکے دور میں اور آج کے دور میں بہت فرق ہے، کل نہ سوشل میڈیا پہ گوناگوں قسم کے مسائل تھے اور نہ اس کا وجود، کل نہ اتنے ٹی وی چینلز تھے اور نہ نیٹ کی آج جیسی سہولت، کل ضروری باتوں کو جاننے کے لئے ایک ہی طریقہ تھا کہ کسی ماہر کے پاس جایا جائے، آج ہر فلیڈ اور ہر

[1] نہج البلاغہ خط ۳۱

میدان کی بیسک و بنیادی معلومات سے دقیق مفاہیم تک چھوٹے سے موبائل اسکرین پر نیٹ کے ذریعہ دستیاب ہیں، کل خود کو گناہوں سے بچانا آسان تھا کہ اپنے آپ کو ایسی جگہوں پر لے جانا پڑتا تھا جہاں انسان گناہ کر سکے، آج ہر قسم کے گناہ کے لئے محض انسان کو تنہائی کی ضرورت ہے اور وہ انٹرنیٹ کے ذریعہ کہیں بھی پہنچ سکتا ہے اور بڑے سے بڑے گناہ کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے۔ کل گناہ کار و مجرم لوگوں کے علاقوں کو بدنام شمار کیا جاتا تھا اور ایسے علاقوں میں جانے والوں کی روک تھام کی جاسکتی تھی، آج برقی لہروں نے ہر قسم کے حصار جرم کو توڑ دیا ہے نہ کوئی جغرافیہ ہے نہ کوئی سرحد ہے، انسان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا موبائل ہے اور وہ جہاں چاہے جاسکتا ہے اوپر سے ایسے مجرم و خطرناک قسم کے موذی لوگ موجود ہیں جو سیدھے سادے جوانوں کے لئے جال بچھائے بیٹھے ہیں کہ انکے جال میں کوئی پھنسے، تو اپنے شکار کو من چاہے انداز میں حلال کریں۔ اس تمام صورتحال کو سمجھتے ہوئے ہمارے ماں باپ اور بزرگوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے جوانوں کو لاحق خطرات کو باریکی کے ساتھ دیکھیں اور متوجہ ہوں کہ انکی دنیا بہت مختلف ہے اور وہ جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس سے ہم بہت دور ہیں اور ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ آج کے دور کے جوان کو کتنے چیلینجز کا سامنا ہے، لہٰذا صبر و تحمل اور بردباری سے کام لیتے ہوئے جوانوں کو تھوڑا وقت دینے کی ضرورت ہے، انکے مسائل کو درک کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی جوان نسل کی صحیح رہنمائی کی جائے تاکہ یہ لوگ زندگی میں کامیاب و سربلند ہو سکیں اور کیا ہی بہتر ہو کہ رہنمائی اپنے تجربات کے ساتھ دین کے ان اصولوں کی روشنی میں ہو جو جاوداں ہیں اور جنکی پیروی کرنے سے نہ صرف انسان سکون حاصل کرتا ہے بلکہ سربلندی کو کامیابی کو بھی اپنا مقدر بنالیتا ہے۔ امید کہ جناب علی اکبر علیہ السلام کی ولادت کی مناسبت ایک بہانہ بن جائے اور ہم اپنی زندگی کی روزمرہ کی مصروفیات سے تھوڑا وقت نکال کر اپنی جوان نسل کے مسائل پر بھی غور کریں گے کہ یہی ہمارا مستقبل ہیں اور ہماری زندگی کی کامیابی ان کی کامیابی سے جڑی ہے۔

* * *

مدح امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف

مہدی برحق کی ضرورت

علامہ اقبال

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار
پیران کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں نے جدت گفتار ہے، نے جدتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

نور فروزان

سید سجاد اطہر موسوی

اے شمع دل و دیدۂ احرار کہاں ہو اے نور فروزانِ شبِ تار کہاں ہو
اے باغ رسالت کے حسین پھولوں کا دستہ اے وارث پیغمبر مختارؐ کہاں ہو
مظلوم و ستم دیدہ و بے چارہ ہوئے ہم اے حامی و اے مونس و غمخوار کہاں ہو
اس دور میں ہے جان ہتھیلی پہ ہماری مشکل میں ہے جینا میرے دلدار کہاں ہو
ہے عشق کے ہونٹوں پہ سدا نام تمہارا ہم سب ہیں تیرے طالب دیدار کہاں ہو
چھائی ہے گھٹا ظلم کے تاریک ہے دنیا اے شمع عدالت کے نگہدار کہاں ہو
آمادۂ حرکت ہے تیرے قافلہ والے بس یہ ہے صدا قافلہ سالار کہاں ہو
اے منتقم خون شہیدان رہ حق اے نوحہ گر زینبؑ غمخوار کہاں ہو
اے مہدی موعودؑ امم، حاکم برحق اے زمزمۂ عالمِ افکار کہاں ہو
مر جاؤں تو رجعت کی ہے امید اے آقا اطہر کو عطا ہو تیرا دیدار کہاں

عصر غیبت میں خواتین کی فردی اور اجتماعی ذمہ داریاں

سید منظور عالم جعفری سرسوی

مقدمہ:

امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے غیبت کے دو دور ہیں جن کو غیبت صغری اور غیبت کبری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ غیبت صغری میں امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کے چار نائب تھے جو نواب اربعہ کے نام سے مشہور ہیں، اختلاف روایات کی بنا پر غیبت صگری کا مجموعی زمانہ ۶۹ یا ۷۴ سال کا تھا۔ غیبت کبری امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف کی غائبانہ زندگی کا دوسرا دور ہے جو سنہ ۳۲۹ھ میں آپ کے چوتھے نائب علی بن محمد سمری کے انتقال سے شروع ہوا اور آپ کے ظہو تک جاری رہے گا جس زمانے میں ہم زندگی گزار رہے ہیں یہ اسی عصر غیبت کبری کا حصّہ ہے، اس میں حجت خدا و خلیفۂ خدا نظروں سے اوجھل ہیں اور دنیا والے ان کی آمد اور ظہور کا انتظار کر رہے ہیں۔

اس دور میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ افراد جو اپنے امام، پیشوا، آقا و مولا یا حجت خدا کے ظاہر ہونے کا انتظار کر رہے ہیں کیا ان کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں؟ یا نہیں؟ اور اگر کچھ ذمہ داریاں ہیں تو کیا وہ صرف مردوں سے مخصوص ہیں یا اس میں خواتین کی بھی ذمہ داریاں ہیں؟۔

اس میں کوئی شک نہیں ایک انسان اور شیعہ ہونے کے حساب سے اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان میں کوئی فرق نہیں ہے ،اسلام نے انسان کی ایک دوسرے پر برتری کا معیار تقوی و پرہیز گاری کو قرار دیا ہے، ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ تم میں خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔[1] لہذا جو تقوی کے جتنے بلند درجات پر فائز ہوگا وہ اتنا ہی اللہ کے نزدیک مقرب بندہ ہوگا۔

لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ دونوں صنف اپنی خلقت اور نشو و نما کے اعتبار سے ایک دوسرے سے فرق رکھتی ہیں، اسی وجہ سے جہاں اسلام میں کچھ احکامات مشترک ہیں وہاں ایسے بھی احکامات ہیں جو کسی ایک صنف سے مخصوص ہیں، اسی طرح عصر غیبت امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف میں کچھ ایسی ذمہ داریاں جس میں مرد اور عورت مشترک ہیں اور کچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں جو کسی ایک

[1] سورہ حجرات آیت ۱۳

خاص صنف سے مخصوص ہیں، اس مقالے میں پہلے مختصرا ان ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کیا جائے گا جو مرد اور عورت کے درمیان مشترک ہیں، پھر تفصیلی طور پر عصر غیبت میں خواتین کی فردی اور اجتماعی ذمہ داریاں کو بیان کیا جائے گا۔

الف: عصر غیبت میں مومنین کی ذمہ داریاں

ذیل میں اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم ان اہم ترین ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کریں گے جن میں مرد اور خواتین دونوں ہی شریک ہیں۔

۱- **معرفت خدا، رسول خدا اور معرفت امام زمانہ** عجل اللہ فرجہ الشریف: سب سے پہلی اور اہم ذمہ داری یہ ہے کہ ہم جس دین کے پیروکار ہیں، اس دین کے بھیجنے اور لانے والے کی معرفت کے ساتھ ساتھ اس دین کے محافظ کی معرفت حاصل کریں۔ جیسا کہ شیخ کلینی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے زرارہؒ کو یہ دعا تعلیم فرمائی کہ ہمارے شیعہ امام زمانہ (عج) کی غیبت اور اپنی آزمائش و امتحان کے سخت موقع پر اس دعا کو ضرور پڑھیں، وہ دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنِی نَفْسَكَ فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِی نَفْسَكَ لَمْ أَعْرِفْ نَبِيَّكَ اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنِی رَسُولَكَ فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِی رَسُولَكَ لَمْ أَعْرِفْ حُجَّتَكَ اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنِی حُجَّتَكَ فَإِنَّكَ إِنْ لَمْ تُعَرِّفْنِی حُجَّتَكَ ضَلَلْتُ عَنْ دِينِی[1].

بارالٰہا؛ تو مجھے اپنی معرفت عطا کر اس لئے کہ اگر تو نے مجھے اپنی معرفت عطا نہیں کی تو مجھے تیرے نبی کی معرفت حاصل نہ ہو گی۔ خدایا! تو مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا کر اس لئے کہ اگر تو نے مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا نہیں کی تو مجھے تیرے حجت کی معرفت حاصل نہ ہو گی۔ میرے اللہ: تو مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا کر کیونکہ اگر تو نے مجھے اپنی حجت کی معرفت نہیں عطا کی تو میں اپنے دین ہی سے گمراہ ہو جاؤں گا۔

لہذا جیسا کہ مولائے کائناتؑ نے بھی فرمایا ہے: دین کی ابتدا معرفت پروردگار سے ہے، ہمیں اللہ کی معرفت کے ساتھ رسولؐ اور جانشین رسولؐ کی معرفت حاصل کرنا چاہیے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من ماتَ وَلَم يَعرِفْ إمامَ زَمانِهِ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيّة

جو شخص بھی اپنے زمانے کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے[2]۔

۲- **اطاعت و پیروی:** صرف معرفت کا حاصل کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ قرآن کریم اور اہل بیت علیہم السلام کے فرامین اور ان کی ہدایات کے مطابق زندگی گزاری جائے۔ کیوں کہ انتظار اُس ہستی کا کیا جا رہا ہے جو عنقریب دین الٰہی کو دنیا میں

---

[1] اصول کافی، ج ۱، ص ۳۳۷، اسکے علاوہ مفاتیح الجنان میں بھی یہ دعا موجود ہے

[2] اصول کافی، ج ۱، ص ۳۷۷

عام کرے گا،اور اس میں دینی احکامات کو نافذ کرے گا جیسا کہ قرآن کریم کی سورہ فتح کی آیت ۲۸ میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے۔ لہذا اس سنہرے دور کے لئے اگر ہم آمادہ ہونا چاہتے ہیں تو اس کے لئے دین کی تعلیم کردہ ہدایات کے مطابق زندگی گزارنا لازمی ہے۔

۳- تعلیمات اہلبیت علیہم السلام کو لوگوں تک پہونچانا: معرفت کو حاصل کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ضروری ہے کہ کہ ان کی تعلیمات کو دوسروں تک پہونچائیں۔ جیسا کہ امام حسن عسکری علیہ السلام نے غیبت کے زمانے میں دینی فرامین کی وضاحت اور اسکی تبلیغ و تشہیر کی ذمہ داری علماء کرام پر رکھی ہے۔ خود امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف نے اپنی غیبت کے ابتدائی ایام میں پیروان راہ حق کی رہنمائی علماء کی جانب فرمائی اور انہیں حکم دیا کہ وہ با تقوا علمائے حق کی پیروی کریں اور اپنی زندگی کے مسائل میں ان کی جانب رجوع کریں۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ یہ ذمہ داری صرف علماء کی نہیں ہے بلکہ ہر مومن کی ذمہ داری ہے۔

۴- عالم انسانیت کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ: عقیدۂ مہدویت صرف مسلمانوں یا شیعوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کہ تمام ادیان اور مکاتب فکر میں ''منجی'' کا تصور پایا جاتا ہے،لہذا ضروری ہے تمام برادران ایمانی کے ساتھ ساتھ برادران وطن سے رواداری برتی جائے تاکہ پوری بشریت ایک ساتھ مل کر عالمی سطح پر مہدوی سماج کی تشکیل کے لئے زمین ہموار کر سکے۔

۵- دشمن کی شناخت: انسانیت کا اصلی دشمن شیطان ہے،جو اول روز سے ہے اور قیامت تک رہے گا،لہذا ہر مومن کی ذمہ داری ہے کہ عصر غیبت میں دین،ایمان،اسلامی ثقافت،حیا اور اخلاق و کردار کو نشانہ بنانے والے دشمنان اسلام اور سامراجی طاقتوں کے منصوبوں سے ہوشیار رہیں۔ اور ان کے شیطانی منصوبوں کے مقابلے میں ایک صحیح لایحہ عمل کے تحت واحد قیادت کے سائے میں آگے بڑھا جائے۔

ب: عصر غیبت میں خواتین کی فردی اور اجتماعی ذمہ داریاں

ذیل میں عصر غیبت میں خواتین کی ذمہ داریوں کو دو حصوں میں بیان کریں گے۔

۱) عصر غیبت میں خواتین کی فردی و خانوادگی ذمہ داریاں

جیسا کہ حدیث کساء میں موجود افراد کے تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی خاندان کا اصل محور عورت ہوتی ہے،وہ خاندان کی بنیاد قائم کرتی ہے اور خاندان میں عورت کے جذباتی اور نفسیاتی اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاندان میں خواتین کے اثر و رسوخ کو ماں، بہن اور بیوی کے کردار میں مختلف پہلوؤں سے اور ظاہری انداز میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان بنیادی کرداروں کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے،جن کا ذکر قرآن میں بھی ہے،ہم ذیل میں عصر غیبت میں خواتین کی فردی اور خانوادگی ذمہ داریاں کا جائزہ لیں گے۔

۱- **باطن کو بری خصلتوں سے پاک کرنا اور اپنے آپ کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرنا:** خود کی اصلاح اور اور اچھے اخلاق سے آراستگی ان مسائل میں سے ایک ہے جس پر ہر زمانہ میں ہر مومن کو توجہ دینی چاہیے۔ وہ خواتین جو حجت آخر کا انتظار کر رہی ہیں، ان کو چاہیے اپنی عفت کی حفاظت کریں، یعنی اپنے نفس کو نفسانی خواہشات اور شہوتوں سے بچائیں، اور اپنی روح کی بلندی کے لیے زمینہ فراہم کریں، اور شیطانی فتنوں کی پیروی سے پرہیز کریں۔

۲- **خواتین آنے والے نسل کی معلم:** اسلام نے ماں کو خصوصی اہمیت دی ہے اور قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہوئے ماں کو خصوصی مقام دیا ہے۔ کیونکہ ایک ماں اپنے عمل اور طرز عمل سے اپنے بچوں کو اللہ کی اطاعت اور امامؑ کی خدمت کا معیار سکھا سکتی ہے۔ جس طرح امام حسن مجتبی علیہ السلام اپنی والدہ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو دیکھتے ہیں جو رات سے صبح تک عبادت خدا میں مشغول رہتی ہیں اور اپنے پڑوسیوں کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔

وہ ماں جو خدا اور وقت کے امام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے محبت کا مظہر ہے، اور ہر صبح کا آغاز دعائے عہد سے کرتی ہے، رضائے الٰہی کے سوا کوئی قدم نہیں اٹھاتی، اپنے رات و دن کو اپنے وقت کے امامؑ اور خدا کے ذکر کے ساتھ اپنے شوہر بچوں کی خدمت میں گزارتی ہے، یقیناً اس کے اس عمل سے خاندان پر گہرے معنوی اثرات مرتب ہوں گے۔ کیونکہ بچپن میں بچے والدین سے متاثر ہوتے ہیں اور والدین کو رول ماڈل مانتے ہیں۔ اس لیے والدین کا ایک دوسرے کے ساتھ صحیح برتاؤ اور بالواسطہ تعلیم جو بچے رول ماڈلنگ کے ذریعے سیکھتے ہیں ان کے مستقبل پر زبردست اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس لیے ماں کو بچہ کی تعلیم و تربیت میں اسلامی نظام تعلیم کو معیارِ تعلیم و تربیت قرار دینا چاہیے تاکہ آنے والی نسل اسلام کے حتمی مقاصد کے ساتھ تعلیم یافتہ ہو اور گمراہ اور بے مقصد نسل نہ بن جائے۔

۳- **شوہر اور خانوادہ کی حفاظت:** مہدوی معاشرے میں خواتین کا سب سے اہم مذہبی اور اخلاقی فریضہ ایک بیوی ہونے کی ذمہ داری قبول کرنا، اور خانوادہ میں خاندان کے وارث (شوہر) کو اہمیت دینا اور گھر کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ خاص طور پر موجودہ دور میں جب زوال پذیر مغربی ثقافت نے ہمیشہ حقوق نسواں کا پرچار کر کے خواتین کے اس فطری اور اخلاقی فرض کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود پر عزم اور با اخلاق خواتین نے ہمیشہ اپنے شوہروں کے تئیں اپنی مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری کے بارے میں بصیرت اور آگاہی کے ساتھ فخر کیا ہے۔ بے لوث خواتین جیسے "زہیر ابن قین بجلی کی اہلیہ دلہم بنت عمرو، جن کا گھر اور خاندانی ماحول میں بھی رہنمائی کا کردار ہے اور انہوں نے اپنی نجات کے ساتھ ساتھ دنیا کو انتظار کی پرورش کی سعادت بھی فراہم کی ہے۔

۴- حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے بیوی اور ماں کے کردار کو بے نظیر طریقہ سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنے بچوں حسنؑ و حسینؑ اور زینبؑ و ام کلثومؑ کی پرورش اپنے ایک چھوٹے سے گھر میں اس طرح کی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی زندگی کے میدان

میں تاریخ ساز اور انقلابی تھا۔ اسلام کی یہ مثالی خاتون اپنے شوہر کے لیے ایک خوشگوار اور پاکیزہ ماحول فراہم کرنے میں کامیاب رہی جس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جب بھی میں گھر آتا ہوں اور میری نظر فاطمہؑ پر پڑتی تو میں اپنے غم کو بھول جاتا ہوں۔ ہماری خواتین کو بھی اپنے گھریلو ماحول اسی طرح خوشگوار رکھنا چاہیے۔

۲) عصر غیبت میں خواتین کی اجتماعی ذمہ داریاں

انفرادی فرائض کی انجام دہی کے بعد خواتین مختلف سماجی شعبوں میں بھی اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ جس طرح ابتدائے اسلام سے لے کر سماجی میدانوں میں خواتین کی سرگرمیاں اور ان کی رسولؐ و امامؑ کی حمایت عیاں ہے، اسی طرح عصر غیبت میں بھی خواتین جب تک تمام سماجی امور میں اپنا کردار بخوبی ادا کرتی رہیں گی، اس سے سماجی بنیادیں مضبوط ہوں گی اور عالم اسلام پر غلبہ پانے کی متکبرانہ سازشوں کو ناکام بنایا جاسکے گا، اور ظہور کے لیے بنیادیں فراہم کی جاسکیں گیں۔

۱- **سماجی بیداری:** اگر معاشرے میں امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی موجودگی کے بارے میں سماجی بیداری پیدا نہ ہو، تو جس طرح سماجی بیداری نہ ہونے کیوجہ سے ائمہ معصومین علیہم السلام کو اپنے زمانے میں جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا، اور لوگوں نے ان کو تنہا چھوڑ دیا، اور ان کی مدد نہ کی، اسی طرح سماجی بیداری کا نہ ہونا امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کی عدم موجودگی اور ظہور میں تاخیر کا سبب بنی۔ لہذا امام زمانہ (عج) کے ظہور کے لیے موثر کردار ادا کرنے کے لیے خواتین کو انتظار کرنے والوں کے عمومی فرائض سے آشنا ہونا چاہیے، اور دیگر خواتین کو بھی انسان کامل حضرت امام عصر (ارواحنالہ الفدا) کے بارے میں بتانا چاہیے تاکہ وہ بھی امام زمانہ علیہ السلام کے نقش قدم پر چل سکیں اور ایک مہدوی معاشرہ تشکیل دیں سکیں۔

۲- **اسلامی اقدار کی حفاظت:** اسلامی معاشرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے دشمنوں کا ایک موثر طریقہ ثقافتی تسلط ہے، جس میں کامیابی کے لیے دشمن اپنے تمام ہتھیار استعمال کرتا ہے، مغربی ثقافتی یلغار کا ایک اہم ترین عنصر ادراک اور عقائد کی تبدیلی، اقدار اور رجحانات کی تبدیلی ہے، جس سے رویوں اور اعمال میں بھی تبدیلی آئے گی۔ اسلامی احکام کی ترویج میں خواتین کا کردار ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ ان نازک حالات میں جہاں مردوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، حضرت زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا جیسی خواتین نے امامت کا ساتھ دیا اور دشمن کے پروپیگنڈے سے لوگوں کو آگاہ کیا، اور جس طرح خواتین نے ہمیشہ اسلام اور اسلامی اقدار کے دفاع میں حصہ لیا اور اسلام کی بقا میں نمایاں کردار ادا کیا، اس پر آشوب زمانہ میں بھی خواتین کی ذمہ داری ہے کے وہ جناب زہرا علیہا السلام اور جناب زینب سلام اللہ علیہا کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے اسلامی اقدار کی حفاظت کریں، اور دین اسلام کا دفاع کریں۔

۳- **معاشرے میں معاشی انصاف کی بنیاد:** ظہور کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرنے کے لیے معاشرے میں معاشی انصاف کی بنیاد فراہم کی جانی چاہیے اور دوسری طرف لوگوں کے سماجی اور معاشی شعور کو بیدار کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ وہ ایک منصفانہ معیشت

کی پیروی کریں اور امیر اپنے ماتحت افراد کے معاشی حقوق کا احترام کریں اور خمس، زکوٰۃ اور دیگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔ خواتین اور مردوں کو چاہیے کہ وہ ان معاشی حقوق سے واقف ہوں جو اسلام نے انھیں دیئے ہیں اور ان سے صحیح طریقے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

خلاصہ کلام: امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی پہچان اور معرفت ہر مسلمان کا اہم ترین فریضہ ہے۔ کیونکہ یہ دنیا اور آخرت میں اس کے کام آتی ہے۔ دنیا میں امام کو صحیح طریقے سے پہچاننے میں ناکامی گمراہی اور جہالت کی موت کا سبب بنتی ہے۔ اس لئے تمام مومنین کی ذمہ داری معرفت امامؑ کے ساتھ ان کی اطاعت اور ان کے علوم کو نشر کرنا، اور آپسی یکجہتی اور بھائی چارگی سے دشمنوں کی سازش کو ناکام کرنا ہے۔ مردوں کی طرح خواتین کی بھی عصر غیبت میں فردی اور اجتماعی ذمہ داریاں ہیں، لہذا ضروری ہے کے وہ جناب زہرا علیہا السلام اور جناب زینب سلام اللہ علیہا کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے اپنے بچوں کی تربیت کریں اور سماجی بیداری کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کی حفاظت کریں، اور دین اسلام کا دفاع کریں۔ اور ایک مہدوی معاشرہ تشکیل دینے میں مردوں کی مدد کریں۔

اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنی نَفْسَكَ، فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تُعَرِّفْنی نَفْسَكَ، لَمْ اَعْرِف نَبِيَّكَ؛ اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنی رَسُولَكَ، فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تُعَرِّفْنی رَسُولَكَ، لَمْ اَعْرِفْ حُجَّتَكَ؛ اَللّٰهُمَّ عَرِّفْنی حُجَّتَكَ، فَاِنَّكَ اِنْ لَمْ تُعَرِّفْنی حُجَّتَكَ، ضَلَلْتُ عَنْ دینی.

بارالٰہا؛ تو مجھے اپنی معرفت (شناخت) عطا کر اس لئے کہ اگر تو نے مجھے اپنی معرفت نہیں عطا کی تو مجھے تیرے نبی کی معرفت حاصل نہ ہوگی. خدایا! تو مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا کر اس لئے کہ اگر تو نے مجھے اپنے رسول کی معرفت نہیں عطا کی تو مجھے تیرے حجت کی معرفت حاصل نہ ہوگی۔ میرے اللہ: تو مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا کر کیونکہ اگر تو نے مجھے اپنی حجت کی معرفت نہیں عطا کی تو میں اپنے دین ہی سے گمراہ ہو جاؤں گا۔

مناجات شعبانیہ اور طرز زندگی

علی خصر عمرانی

مقدمہ

خداوند متعال نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس عالم کا ذرہ ذرہ اسکی خدمت کیلئے خلق کیا جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوتا ہے **خَلَقْتُ الْأَشْيآءَ لِأَجْلِك، وَ خَلَقْتُك لِأَجْلِي** (اے بنی آدم) میں نے چیزوں کو تیرے لئے خلق کیا ہے اور تجھے اپنے لئے خلق کیا ہے۔[1] خدا نے انسان کو عقل جیسی نعمت سے نوازا جس کی بناء پر وہ تمام دیگر مخلوق سے سرفراز اور ممتاز ہے یہاں تک کہ ملائکہ بھی اس کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے لیکن ہر انسان اس عظیم مرتبہ پر فائز نہیں ہوسکتا فقط وہ ہی فرشتوں اور تمام مخلوقات پر فوقیت رکھے گا جو توحیدی زندگی گزارے گا۔

انسان کی زندگی میں مختلف اتار چڑھاؤ ہوتے ہیں، اس کی حالت نفسانی مختلف ہوا کرتی ہے، کبھی وہ خوشحال رہتا ہے تو کبھی غمگین، کبھی کسب و معاش میں فائدہ اٹھاتا ہے تو کبھی نقصان۔ انسان کی ہدایت اور ان مختلف کیفیات میں جو چیزیں بڑھ کر سہارا دیتی ہیں ان میں ایک آئمہ معصومین علیہم السلام کی مناجات اور دعائیں ہیں، یہ دعائیں اور مناجات جنبہ توحیدی کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی کے مختلف حالات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں کہ ان مناجات میں سے ایک مناجات شعبانیہ بھی ہے۔

مناجات شعبانیہ کا مختصر تعارف

مناجات شعبانیہ کو ابن خالویہ نامی شخص نے امام علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے اور دیگر آئمہ معصومین علیہم السلام نے اس مناجات کو ماہ شعبان میں پڑھنے کی تاکید بھی کی ہے اور اکثر علماء نے اس مناجات کی تائید فرمائی ہے۔

دعاؤں کی قبولیت کیلئے محمد ﷺ اور ان کی پاکیزہ آل پر درود بھیجنا

مناجات کا پہلا فقرہ آئمہ معصومین پر درود و سلام سے شروع ہوتا ہے، مناجات شعبانیہ کا یہ جملہ ایک مومن کو یہ سکھا رہا ہے کہ جب بھی تم خدا سے کوئی چیز طلب کرنا چاہو تو خدا کی حمد و ثناء اور محمد و آل محمد ﷺ پر درود و سلام بھیج کر اپنا مدعا پیش کیا کرو۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ **وَابْتَغُوا إِلَيه الْوَسِيلَةَ** اور اس کی طرف (قربت کیلئے) وسیلہ/ذریعہ تلاش کرو۔[2] اور بارگاہ خداوندی میں محمد ﷺ اور انکی ذریت بہترین وسیلہ ہیں لہذا قرآنی دستور بھی ہے اور یہ بات ہمیں اپنی عادی زندگی میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے ہم

---

[1] شرح اصول کافی ج۴ ص۲۲۸؛ الجواہر السنیہ، ص۲۸۴

[2] سورہ مائدہ آیۃ ۳۵

جب بھی کسی بڑی شخصیت کے پاس جاتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ کوئی وسیلہ ایسا مل جائے کہ جس سے کام آسانی کے ساتھ اور جلدی انجام پا جائے۔

پس ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی زندگی میں مسلسل اہلبیت علیہم السلام سے اپنے رابطہ کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہیں اور ہمیشہ ان سے منسلک رہیں۔

زندگی میں ہمیشہ دعا کا دامن تھامے رہنا

و اسمع دعائی اذا دعوتك مناجات کے اس جملے سے چند نکات سامنے آتے ہیں جنہیں بطور درس اخذ کیا جاسکتا ہے:

- پہلا تو یہ کہ ہم مسلسل اپنی ناتوانی، کمزوری اور حقارت کو مد نظر رکھیں چونکہ بعض نمرود و فرعون جیسے لوگ جب اپنی حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور پھر **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی** کا دعوا کرنے لگتے ہیں اگر دعا کے اس پہلو پر غور و فکر کی جائے کہ دعا، دانی (پست) کا عالی (بلند) سے سوال کرنے کا نام ہے تو ممکن ہی نہیں ہے کہ وجود انسانی میں انانیت جنم لے سکے۔

- انسان کو خدا ہی سے طلب کرنا چاہیئے اور اسی سے سوال کرنا چاہیئے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: **اِسْتَغْنُوا عَنِ النَّاسِ وَلَوْ بِشَوْصِ السِّواك** لوگوں سے بے نیاز ہو جاؤ گرچہ مسواک کی ڈنڈی اٹھانے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو[1]۔ انسان جب خدا کے علاوہ کسی اور سے سوال کرتا ہے تو خود کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے **طَلَبُ الْحَوائِجِ اِلَی النَّاسِ مَذَلَّةٌ لِلْحَیاءِ**[2] لوگوں سے طلب کرنے میں ذلت و خواری ہے۔

- انسان جب بھی خدا کو پکارتا ہے تو خدا ہمیشہ اس کی دعا کو سننے کیلئے آمادہ رہتا ہے، **اذا دعوتك** کی تعبیر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے چونکہ اذا شرطیہ کا مفہوم بتا رہا ہے کہ ممکن نہیں ہے خدا کو پکارا جائے اور وہ نہ سنے۔ لہذا انسان کو ہر حال میں اور ہر چیز خدا سے طلب کرنی چاہئے چاہے وہ جوتے کے تسمے کے جیسی چھوٹی ہی سی ضرورت کیوں نہ ہو۔

خداوند متعال مشکلات سے آگاہ بھی ہے اور اس کو حل کرنے والا بھی

وَ تَعْلَمُ ما فی نَفْسی وَ تَخْبُرُ حاجَتی: مناجات کا یہ جملہ بیان کر رہا ہے کہ خدا میرے نفس اور میری حالت سے باخبر ہے۔ انسان جب کبھی کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو مناجات شعبانیہ کے اس جملہ کو سامنے رکھے تو اس کو سکون قلب حاصل ہوگا۔ انسان کو ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ خداوند متعال میرے تمام حالات سے آگاہ ہے اسے میری مشکلات کا بھی علم ہے۔ اگر کوئی مشکل یا پریشانی تا دیر باقی بھی رہے تو یا اس میں بندہ کیلئے بھلائی ہے یا پھر بندہ کے اپنے اعمال کی وجہ سے ایسا ہے، چونکہ یہ مسلم ہے

---

[1] کنز العمال ح ۷۱۵۶؛ من لایحضرہ الفقیہ، جلد ۲، صفحہ ۷۱

[2] تحف العقول: ۲۷۹

خدا مہربان ہے یہ جو تعبیر استعمال ہوا کرتی ہے کہ خدا ۷۰ ماؤں سے زیادہ مہربان اور محبت کرنے والا ہے اس سے مراد عدد نہیں ہے بلکہ یہ سمجھانے کیلئے ہے کہ وہ ماں سے کہیں زیادہ مہربان ہے وگرنہ خدا چونکہ خود لامحدود ہے لہذا اسکی مہربانی بھی محدود نہیں ہے، تو کیسے ممکن ہے کہ خدا مہربان بھی ہو اور اپنے بندے کی پریشانی کا بھی علم رکھتا ہو اور پھر بھی اپنے بندوں کی مشکل باقی رکھے تو پھر تو پھر مشکلات کیوں باقی رہتی ہیں اس کی تاویل کیا ہے اس کی توجیہ یہ کہ خدا اس مشکل و پریشانی کے ذریعہ بندے کی صلاحیت اور اس کے درجات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

پس زندگی کا اہم درس جو اس فراز سے اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں پریشانیوں اور بلاؤں میں گرفتار ہونے کے بعد بھی سکون قلب کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے اور سورہ الم نشرح کی اس آیت آیت اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ہر ایک مشکل کے ساتھ آسانیاں ہیں[1] کے پیش نظر مطمئن رہنا چاہیے کہ مشکلات کا دور ختم ہو جائے گا اور آسانیوں کا دور عنقریب ہی آجائے گا۔

دوسری چیز جو اس فراز سے سمجھی جاسکتی ہے وہ یہ کہ انسان جب ہر وقت یہ بات سامنے رکھے گا خدا میرے ضمیر میں پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے تو اس کا قلب امراض باطنی سے پاکیزہ ہو جائے گا۔

صرف خدا ہی کی ذات رازق ہے

اِلهی اِنْ حَرَمْتَنی فَمَنْ ذَا الَّذی یَرْزُقُنی؛ وَاِنْ خَذَلْتَنی فَمَنْ ذَا الَّذی یَنْصُرُنی؛

مناجات کا یہ فراز انسان کو حوصلہ عطا فرماتا ہے اے انسان رازق حقیقی صرف خدا کی ذات اعلیٰ ہے تجھے گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم فراز کے اس ٹکڑے پر غور و فکر کریں کہ خدا کے علاوہ ہمیں کوئی اور رزق نہیں دیتا تو انسان کی کئی ساری مشکلات حل ہو جائیں گی بعنوان مثال چند چیزیں جو ہم یہاں سے سمجھ سکتے ہیں زیر نظر ہیں:

آج جوانوں کی شادی کی عمر ڈھلتی جارہی ہے وہ اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کوئی اچھی نوکری یا کوئی اچھا مشغلہ مل جائے اس کے بعد شادی کریں گے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم ابھی شادی کرلیں گے تو کون ہمیں رزق دے گا کہاں سے کھائیں گے کیا کھلائیں گے۔ لیکن اگر اس بات پر یقین ہو جائے کہ خدا ہی کی ذات ہے جو رازق ہے تو یہ سارے مسائل حل ہو جائیں۔ البتہ یہ چیز بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ خدا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

دوسرا مسئلہ آج معاشرہ میں بعض لوگ بعض لوگوں کی بلاوجہ چاپلوسی کرتے ہیں جبکہ وہ خود بھی نہیں چاہتے کہ ایسا کریں لیکن چونکہ سوچتے ہیں کہ اگر سامنے والے کی چاپلوسی نہیں کریں گے، اس کی تعریف میں چند کلمات نہیں کہیں گے تو وہ ہماری روزی و روٹی پر لات ماردے گا۔ لہذا چاہے ان چاہے بھی تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ مناجات کا یہ جملہ بتا رہا ہے اے انسان کیوں آخر ان کو اپنا رازق سمجھ بیٹھا ہے جبکہ رازق حقیقی خداوند متعال ہی کی ذات ہے

---

[1] سورہ الم نشرح آیۃ ۶

خدا کے غضب سے خدا کی پناہ

اِلٰهی اَعُوذُبِكَ مِنْ غَضَبِكَ وَ حُلُولِ سَخَطِكَ

انسان کو خدا کے غضب سے ہر لمحہ پناہ مانگنی چاہئے، انسان کو خدا نے اپنی بندگی کیلئے خلق کیا ہے، اس کو خلق کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ چھپی ہوئی خصلیتیں جو خدا نے اس کے وجود میں رکھی ہیں ان کو اجاگر کر کے کمال و بلندی حاصل کرے مگر جب انسان اس کے برخلاف گناہوں میں ڈوبتا چلا جائے اور اپنی خلقت کے اس حقیقی مقصد کو بھلا بیٹھے اس وقت معاشرہ کو غضب الٰہی سے ڈرنا چاہئے ۔ آج معاشرہ مختلف مصیبتوں اور وباؤں میں گرفتار ہے، طرح طرح کی بیماریاں جنم لے رہی ہیں یہ خدا کا غضب ہی ہے۔ ضروری نہیں کہ قہر الٰہی ہمیشہ کسی وباء یا کسی عذاب کی صورت میں ہی نازل ہو بلکہ دوسری اچھی عادتوں سے محروم ہو جانا بھی اس کا ایک مصداق ہے علماء فرماتے ہیں اگر ایک گھرانہ اچھی عادت واطوار مثلاً قرآن کی تلاوت سے محروم ہو جائے تو اسے فکر مند ہونا چاہئے کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ خدا کا غضب ہو۔ پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت اور مناجات میں یہ جملہ سننے کو ملتا ہے: الٰهی لَا تَكِلْنِی اِلَی نَفْسِی طَرْفَةَ عَيْنٍ اَبَداً خدایا مجھے ایک پلک جھپکنے کے لمحہ برابر بھی میرے حال پر نہ چھوڑنا[1] لہذا ہر آن خدا کے غضب سے پناہ مانگنی چاہئے۔

گناہوں کا اعتراف

اِلٰهی اِنْ عَفَوْتَ فَمَنْ اَوْلٰی مِنْكَ بِذٰلِكَ

اپنے معبود کے نزدیک بندہ کا اپنے گناہوں کا اقرار کرنا نیک و اچھی خصلتوں میں سے ہے البتہ توجہ رہے خدا کے علاوہ بندوں کے سامنے اپنے گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف اور اقرار کرنا بری صفات میں سے ہے۔ یہ چیز ہیں کلام معصومین علیہم السلام اور فقہاء کے فتاوی میں بھی دیکھنے کو ملتی۔ جیسے امام علی علیہ السلام نے ایک زانی جس نے مجمع عام میں آکر اقرار کیا تھا اس کے بارے میں کچھ یوں فرمایا کتنا برا ہے وہ شخص جو اتنا برا فعل انجام دے اور اس کے بعد اس کو مجمع عام میں ظاہر بھی کرے[2]۔ یا امام رضا علیہ السلام کے فرمان کے مطابق لوگوں کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ذلت و خواری سمجھا گیا ہے۔[3] یا جیسے آیت اللہ العظمیٰ خوئی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ دوسرے کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرنا حرام ہے۔[4]

مگر بندہ کا اپنے خدا کے سامنے گناہوں کا اقرار کرنا خوبصورت اور قابل تحسین ہے چونکہ انسان مولا کا حق جس طریقہ سے ہے ادا نہیں کر سکتا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح خدا کی بارگاہ میں فرماتے ہیں اَنَا لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلَی

---

[1] بحار الانوار ج ۱۴، ص ۳۸۴؛ مفاتیح الجنان

[2] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۹.

[3] اصول کافی ج ۴، ص ۲۲۱

[4] التنقیح، ج ۴، ص ۲۱۱

نَفْسِكَ؛ (خدایا!) میں تیری ثناء نہیں کر سکتا تو اسی طرح سے ہے جس طرح تو نے خود کی ثناء کی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خدا کی عبادت کا حق کوئی بھی مخلوق ادا نہیں کر سکتی۔

خدا پر توکل

اِلَهِی کَأَنِّی بِنَفْسِی وَاقِفَةٌ بَیْنَ یَدَیْكَ وَ قَدْ أَظَلَّهَا حُسْنُ تَوَكُّلِی عَلَیْكَ فَقُلْتَ مَا أَنْتَ أَهْلُهُ وَ تَغَمَّدْتَنِی بِعَفْوِكَ إِلَهِی إِنْ عَفَوْتَ فَمَنْ أَوْلَی مِنْكَ بِذَلِكَ

یہ عبارت کم از کم دو باتیں کہہ رہی ہے:

۱) خدا کی بے انتہاء رحمت سے آگاہ رہنا:

اس دعا کو پڑھنے والا اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ خدا کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ ناامیدی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ لیکن اس بات کو صرف وہ ہی قبول کرتے ہیں کہ جو خدا کی وسیع رحمت پر توجہ کرتے ہیں جب بھی وہ دیکھتے ہیں کہ میں گناہگار ہوں خطاکار ہوں اس کے باوجود بھی اس نے میرا رزق قطع نہیں کیا، اس نے ہوا کو نہیں روکا، میں گناہ کرتا ہوں لیکن وہ میری خطاؤوں کو بخش دیتا ہے،۔

۲) خدا پر ہی بھروسہ کرنا:

امیدی ایک ایسا عنصر ہے جو ایک خستہ اور ہارے ہوئے انسان کو بھی کامیابی عطا کر دیتا ہے۔ لیکن امید فقط باتوں اور نعروں سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ امید کیلئے کسی اساس وبنیاد کا ہونا لازم ہے اور امید کی اساس وبنیاد توکل ہے۔ توکل کا معنی ہے اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کر دینا اور قدرت لامتناہی پر تکیہ کرنا۔ امید توکل کی پیدائش ہے۔ توکل کی اہمیت کیلئے یہی کافی ہے کہ خدا نے غیر خدا پر توکل کی اجازت نہیں دی ہے اور قرآن مجید میں **عَلَی اللہ** کو مقدم کر کے حصر کا فائدہ لیتے ہوئے متوجہ کیا جارہا ہے کہ توکل کرنے والوں کو صرف اور صرف خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ وَعَلَی اللهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ[1]

عقل وروایات اور تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے جس نے بھی خدا کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ کیا ہے وہ ناامید ہو گئے ہیں اور انھیں زندگی میں شکست نصیب ہوئی ہے۔

خدا ستار ہے ہم بھی ستار بنیں

اِلَهِی قَدْ سَتَرْتَ عَلَیَّ ذُنُوباً فِی الدُّنْیا وَ اَنَا اَحْوَجُ اِلی سَتْرِها عَلَیَّ مِنْكَ فِی الاُخْری اِذْ لَمْ تُظْهِرْها لِأَحَدٍ مِنْ عِبادِكَ الصّالِحِینَ فَلا تَفْضَحْنِی یَوْمَ الْقِیامَةِ عَلی رُؤُوسِ الاَشْهادِ

مناجات کا یہ فراز ایک عظیم درس اپنے اندر سموئے ہوئے ہے

---

[1] سورہ ابراہیم آیۃ ۱۲

انسان کی زندگی خداوند متعال کی مختلف نعمتوں سے مزین ہے کہ انھیں میں سے ایک نعمت خدا کی ستاریت ہے۔ خدا کا ایک نام ستار ہے۔ اسی نام کے سبب خدا اپنے بندوں کے گناہوں کو چھپاتا ہے اور انھیں دوسرے بندوں کے سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ جیسا کہ ہم دعائے افتتاح میں پڑھتے ہیں وَيَسْتُرُ عَلَيَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَأَنَا أُعْصِيهِ وہ (خدا) میری ہر برائی کو چھپاتا ہے جبکہ میں اسکی معصیت کرتا ہوں[1]۔ اور اسی طرح دعائے ابو حمزہ ثمالی میں ہے: أَنَا الَّذِي أَمْهَلْتَنِي فَمَا ارْعَوَيْتُ، وَسَتَرْتَ عَلَيَّ فَمَا اسْتَحْيَيْتُ خدایا تو نے مجھے مہلت دی لیکن میں نے رعایت نہیں کی اور میرے گناہوں پر تو نے پردہ ڈالا، انھیں چھپایا لیکن میں نے پھر بھی شرم نہیں کی[2]۔

عرفاء کہتے ہیں خدا ستار ہے یعنی وہ ہمارے گناہوں کو لوگوں سے چھپاتا ہے اب اگر کوئی شخص اپنے گناہوں کو دوسرے بیان کرے تو گویا کہ خدا اس اس سے ناراض ہے اس کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ تمہارے گناہوں کو چھپا رہا تاکہ تم استغفار کرو اگر تم ایسا نہیں کروگے بلکہ بیان کروگے تو دوسروں کو بھی گناہ کی جرئت ہوگی اور اس طرح معاشرہ فساد کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔

انسان اگر چاہتا ہے کہ اس کی عزت و آبرو قیامت کے دن بھی محفوظ رہے تو اس چاہئے کہ وہ دو کام کرے۔ جو گناہ اس نے انجام دئے ہیں ان کی توبہ کرے اور دوسرا اہم کام یہ کہ وہ بھی دوسروں کے گناہوں کو آشکار نہ کرے۔ خدا اس شخص کو بالکل بھی پسند نہیں فرماتا جو دوسروں کے گناہوں کو لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایک قوم تھی جس کے کچھ عیوب تھے لیکن وہ لوگ چونکہ دوسروں کے عیبوں کی نسبت سے خاموش رہتے تھے تو خدا نے بھی ان کے گناہوں کو دوسروں کے سامنے آشکار نہیں کیا۔ اسی طرح مدینہ میں ایک قوم اور تھی جن میں ظاہرا کوئی عیب نہیں تھے لیکن چونکہ وہ دوسروں کے عیوب کی تلاش میں رہتے تھے اور انھیں لوگوں سے بیان کرتے تھے تو خدا نے بھی ان کے باطنی عیوب کو لوگوں کے سامنے آشکار کر دیا۔[3]

مناجات کے اس فراز سے ہمیں درس ملتا ہے کہ ہمیں بھی اپنے خدا کی طرح دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کرنی چاہئے تاکہ ہمارے عیوب بھی پردے میں رہیں۔ آج معاشرہ چغل خوری کی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے ہمیں اپنے معاشرہ سے اس بیماری کو جلد از جلد ختم کرنا چاہئے۔

---

[1] مفاتیح الجنان ص ۳۲۷

[2] مفاتیح الجنان ص ۷۲۷

[3] بحار الانوار ج ۷۵، ص ۲۱۵

اسلامی معاشرہ میں نفاق کے اسباب و نتائج (آخری قسط)

فیروز علی بنارسی

منافقین کے نفسیاتی خصوصیات

الف)تکبر

منافقین کی ایک نفسیاتی خصوصیت جسے قرآن کریم نے بھی بیان کیاہے تکبر اور اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھناہے: **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ**۔[1] اور جب ان سے کہاجاتاہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے حق میں استغفار کریں گے تو سر پھرا لیتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ استکبار کی بناپر منہ بھی موڑ لیتے ہیں۔

ب)خوف

قرآن کی نگاہ میں منافقین کی دوسری صفت ان کا حد سے زیادہ ڈرنا ہے۔ اس لئے کہ شجاعت کا تعلق ایمان سے اور خوف کا تعلق بے ایمانی سے ہے، جہاں ایمان ہوتا ہے وہاں شجاعت ہوتی ہے۔ شجاعت اللہ کے سچے مومنین کی ایک صفت ہے، لیکن چونکہ منافقین نعمت ایمان سے محروم ہوتے ہیں اور خدا کی لازوال قدرت پر توکل نہیں رکھتے لہٰذا دنیا کی ہر ظاہری قدرت سے ڈرتے ہیں خاص طور سے میدان جنگ جو شجاعت و بہادری کے مظاہرہ کی جگہ ہے، سے بھاگتے نظر آتے ہیں اور دور ہی سے جنگ کے نتیجہ کا انتظار کرتے ہیں: **فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ كَالَّذِي يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ**[2] اور جب خوف سامنے آجائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کیطرف اس طرح دیکھیں گے کہ جیسے ان کی آنکھیں یوں پھر رہی ہیں جیسے موت کی غشی طاری ہو۔

ج)اضطراب اور پریشانی

منافقین کی ایک دوسری نفسیاتی خصوصیت حد سے زیادہ اضطراب و پریشانی ہے، چونکہ منافقین کے ظاہر اور باطن میں اختلاف ہوتا ہے لہٰذا ہمیشہ اس بات سے پریشان رہتے ہیں کہ کہیں ان کے باطنی اسرار فاش نہ ہو جائیں اور ان کا واقعی چہرہ لوگوں کے سامنے نہ

---

[1] سورۂ منافقون:۵

[2] سورۂ احزاب:۱۹

آجائے : يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَا تَحْذَرُونَ ۔[1] منافقین کو یہ خوف بھی ہے کہ کہیں کوئی سورہ نازل ہو کر مسلمانوں کو ان کے دل کے حالات سے باخبر نہ کرے تو آپ کہہ دیجئے کہ تم اور مذاق اڑاؤ اللہ بہر حال اس چیز کو منظر عام پر لے آئے گا جس کا تمہیں خطرہ ہے۔

د)ہٹ دھرمی

منافقین کی ایک نفسیاتی صفت ہٹ دھرمی بھی ہے اور یہ ایک روحانی بیماری ہے جو صحیح معرفت حاصل کرنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

قرآن کریم منافقین کی لجاجت اور ہٹ دھرمی کو اس انداز میں بیان کرتا ہے :صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۔[2] یہ سب بہرے، گونگے اور اندھے ہو گئے ہیں اور اب پلٹ کر آنے والے نہیں ہیں۔

ان کی ہٹ دھرمی ہی سبب بنی ہے کہ جس باتوں کو سننا چاہئے انھیں نہ سنیں، جس کو دیکھنا چاہئے اسے نہ دیکھیں، جس بات کو کہنا چاہئے اسے زبان پر نہ لائیں، آنکھ، کان اور زبان رکھنے کے باوجود، لیکن اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہیں۔

ہ)ہویٰ پرستی

منافقین کی ایک صفت ہوا پرستی اور نفسانی خواہشات کا اتباع ہے۔ وہ لوگ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور عقل، قرآن و روایات کا اتباع کرنے کے بجائے اپنی شیطانی اور نفسانی خواہشات کے تابع اور پیروکار ہیں : أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۔[3] یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگادی ہے اور انھوں نے اپنی خواہشات کا اتباع کیا۔

جاہ طلبی اور دنیا پرستی کے دو نمونے ہیں۔

منافقین کے ثقافتی خصوصیات

ا (اپنے آپ کو مسلمانوں کے ساتھ ظاہر کرنا

---

[1] سورۂ توبہ:۶۴

[2] سورہ بقرہ: ۱۸

[3] سورۂ محمد:۱۶

منافقین اپنے غلط کاموں کو جاری رکھنے اور صاحبان ایمان کے عقیدہ کو خراب کرنے سے پہلے صاحبان ایمان کے اعتماد اور اطمینان کے محتاج ہوتے ہیں، یہ بات ان کے لئے کافی اہمیت کی حامل ہے کہ مسلمین انھیں اپنوں میں شمار کریں اور ان کو شک و تردید کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے اپناتے ہیں:

الف: جھوٹے اور ریاکارانہ بیانات

منافقین اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے لئے بڑے پیمانہ پر جھوٹ کا سہارا لیتے تھے، کبھی جماعت بنا کر رسول خداؐ کی خدمت میں آتے تھے اور آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتے تھے لیکن خداوند عالم نے صراحت کے ساتھ انھیں اس اقرار میں جھوٹا کہا ہے:

إِذَا جَائَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللهِ وَاللهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ۔[1] پیغمبر! یہ منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

ب) جھوٹی قسمیں

منافقین، مسلمانوں میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے تھے :اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ۔[2] انھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنالیا ہے اور لوگوں کو راہ خدا سے روک رہے ہیں۔

وہ جھوٹی قسموں کے ذریعہ اپنے آپ کو مومن اور مسلمان ظاہر کر کے مومنین میں شامل ہونے کی کوشش کرتے تھے :

وَيَحْلِفُونَ بِاللهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ۔[3] اور یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ تم ہی میں سے ہیں حالانکہ یہ تم میں سے نہیں ہیں۔ یہ لوگ بزدل لوگ ہیں۔

ج) غلط کاموں کی توجیہ و تاویل

مومنین کی خوشنودی حاصل کرنے اور حسن نیت کو ثابت کرنے کیلئے منافقین اپنے برے اقدامات اور کاموں کی توجیہ کرتے تھے جیسا کہ منافقین جنگ تبوک میں حاضر نہ ہونے کا سبب اپنی ناتوانی اور کمزوری بتا رہے تھے لیکن پہلے ہی خداوند عالم نے ان کے اس بہانے اور توجیہ سے پردہ اٹھا دیا تھا :لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَاتَّبَعُوكَ وَلَكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ

---

[1] سورۂ منافقون:۱

[2] سورۂ منافقون:۲

[3] سورۂ توبہ:۵۶

لَكَاذِبُونَ۔ [1]پیغمبر اگر کوئی قریبی فائدہ یا آسان سفر ہوتا تو یہ ضرور تمہارا اتباع کرتے لیکن دور کا سفر ان کے لئے مشکل بن گیا ہے ۔عنقریب یہ خدا کی قسم کھائیں گے کہ اگر ممکن ہوتا تو ہم ضرور آپ کے ساتھ نکل پڑتے۔یہ اپنے نفس کو ہلاک کر رہے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔

د)ظاہر سازی

دین کے ظاہری احکام کی سختی سے پابندی کرنا،خوبصورت اور عوام پسند باتیں کرنا اور اصلاح طلب نظریات بیان کرنا منافقین کا اپنے آپ کو مسلمانوں میں سے ظاہر کرنے کا ایک اور طریقہ تھا۔اور یہ ظاہر سازی کبھی کبھی ایسی ہوتی تھی کہ قرآن کے بقول خود رسول خداؐ کو بھی تعجب اور حیرت میں ڈال دیتی تھی: وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۔[2]اور جب آپ انھیں دیکھیں گے تو ان کے جسم بہت اچھے لگیں گے اور بات کریں گے تو اس طرح کہ آپ سننے لگیں۔

منافقین کی ظاہر سازی صرف ان کے کردار ہی سے مخصوص نہیں تھی بلکہ بات کرنے میں بھی کافی دلچسپ اور فریب دینے والے تھے .

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۔[3]اور انسانوں میں ایسے بھی ہیں جن کی باتیں زندگانی دنیا میں بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ بدترین دشمن ہیں۔

۲)عقائد کو کمزور بنانا

منافقین کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے روح اسلام کو چھین لیں اور انھیں راسخ اور محکم عقیدہ اور اس کے اہداف و نتائج سے روک دیں اور اس کام کے لئے شک و شبہہ کا سہارا لیتے ہیں اور طرح طرح کے شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو شک و تردید کی وادی میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں۔

ایک شبہہ جسے منافقین ہمیشہ خاص طور سے جنگ کے موقعوں پر پیش کرتے تھے وہ حق پر نہ ہونے کا شبہہ تھا،جب جنگوں میں مسلمانوں کو نقصانات پہنچتے تھے اور کچھ لوگ درجۂ شہادت پر فائز ہو جاتے تھے یا مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو منافقین کہتے تھے کہ ”اگر ہم حق پر ہوتے تو شکست نہ کھاتے یا قتل نہ ہوتے“منافقین اس طرح کی باتوں کے ذریعہ مسلمانوں میں شک و تردید پیدا کرتے تھے۔

---

[1] سورۂ توبہ:۴۲

[2] سورۂ منافقین:۴

[3] سورۂ بقرہ:۲۰۴

منافقین نے جنگ احد اور اس کے بعد کی جنگوں میں اس غلط اور فاسد طرز فکر کو پھیلانے کی بہت کوشش کی : يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا [1]۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اختیار ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔
منافقین میدان جنگ میں شکست کو رسول کی رسالت اور ان کے دین کی نابودی جانتے تھے اور کبھی یہ کہتے تھے کہ اگر شہید ہونے والے جہاد پر نہ جاتے تو شہید نہ ہوتے۔
پروردگار ان کے اس شبہہ کے جواب میں فرماتا ہے: موت ایک یقینی اور حتمی شے ہے اور اس سے کوئی گریز نہیں ہے، اور جنگ احد میں شہید ہونا رسولؐ کی رسالت کی نابودی نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا ہے وہ موت سے بھاگ نہیں سکتے یا اس کو ٹال نہیں سکتے ہیں :قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ [2]۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم گھروں میں بھی رہ جاتے تو جن کے لئے شہادت لکھی گئی ہے وہ اپنے مقتل تک بہر حال جاتے۔

منافقین کی اجتماعی خصوصیات

۱. اصلاح اور ایمان کا نعرہ

منافقین ہمیشہ اصلاح اور ایمان کے نعرے کے ساتھ سماج میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی بھی کھل کر دین اور نظام اسلامی سے جنگ اور مقابلہ کی بات نہیں کرتے۔
مسجد ضرار کے واقعہ میں منافقین کا نعرہ بیماروں اور معذوروں کی مدد کرنا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے ان کی دلی خواہش اور نیت کو ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا : منافقین نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے اور کفر کو مضبوط بنانے اور مومنین کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لئے یہ مسجد بنائی ہے اور قسم کھا رہے ہیں کہ بندگان خدا کے ساتھ نیکی اور ان کی خدمت کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہے: وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَى [3]۔ یہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف نیکی کے لئے مسجد بنائی ہے۔

۲۔ برائیوں کا حکم دینا اور اچھائیوں سے روکنا

منافقین کا ایک مقصد معاشرہ میں برائیاں رائج کرنا اور اسلامی اقدار کو ختم کرنا ہے: الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ [4]۔ منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں سب ایک دوسرے سے ہیں۔ سب برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور نیکیوں سے روکتے ہیں۔

---

[1] سورۂ آل عمران: ۱۵۴
[2] سورۂ آل عمران: ۱۵۴
[3] سورۂ توبہ: ۱۰۷
[4] سورۂ توبہ، آیت ۶۷

۳۔ کنجوسی

منافقین کی ایک صفت کنجوسی بھی ہے، وہ معاشرہ کی فلاح اور بہبود کے لئے کچھ خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی محروموں اور فقیروں کی مدد کرنے سے روکتے ہیں۔ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ [1] اور اپنے ہاتھوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے سے روکے رہتے ہیں۔ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُّوا [2] یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھیوں پر کچھ خرچ نہ کرو تاکہ یہ لوگ منتشر ہو جائیں۔

۴ :مومنین کا مذاق اڑانا

مومنین کا مذاق اڑانا اور ان کی عیب جوئی کرنا، منافقین کی ایک اور صفت ہے جو ان کے دل اور روحی کی بیماری کی علامت ہے: وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ [3] جب یہ صاحبان ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیاطین کی خلوتوں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہاری پارٹی میں ہیں اور ہم تو صرف صاحبان ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

۵۔ حسد و کینہ

منافقین مومنین اور اسلامی نظام کے بارے میں سخت کینہ اور عداوت رکھتے ہیں جس کا شعلہ ہمیشہ ان کے سینوں میں بھڑکتا رہتا ہے اور کبھی کبھی ان کے دلوں میں پوشیدہ عداوت کا کچھ حصہ ان کے اعمال و گفتار سے ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اس نکتہ کی طرف اشارہ کے ضمن میں فرماتا ہے کہ منافقین کے دلوں میں جو کچھ ہے ان چیزوں سے کہیں زیادہ ہے جو کبھی کبھی ان کی باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے: قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ [4] ان کی عداوت زبان سے بھی ظاہر ہے اور جو دل میں چھپا رکھا ہے وہ تو بہت زیادہ ہے۔

منافقین کے ان تمام سیاسی، نفسیاتی، ثقافتی اور سماجی صفات اور خصوصیات کو مد نظر رکھنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ نفاق کیونکر بہت سی برائیوں اور آفتوں کا سرچشمہ ہے۔

---

[1] سورۂ توبہ: ۶۷

[2] سورۂ منافقون: ۷

[3] سورۂ بقرہ: ۱۴

[4] سورۂ آل عمران: ۱۱۸

مسلمانوں کی بے حسی کے اسباب اور ان کا معالجہ

سید علی ہاشم عابدی

غیرت و حمیت کا تعلق کسی ملک و ملت، یا دین و آئین سے نہیں بلکہ انسان کی فطرت سے ہے۔ یعنی ذات واجب خالق اکبر اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں غیرت قرار دیا ہے اور اس کا بنا یا دین اسلام انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک غیرت مند انسان نہ کبھی منکر خدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی کبھی کسی کو خدا کا شریک سمجھ سکتا ہے، اسی طرح جو حقیقی مسلمان ہوگا وہ غیرت مند انسان بھی ہوگا اور ممکن نہیں کہ کوئی بے غیرت حدود اسلام میں داخل ہو سکے۔

غیرت یعنی اپنے پسندیدہ اور ذاتی امور میں دوسروں کی دخالت برداشت نہ کرنا[1]۔ دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جائے کہ اپنے ذاتی اور محبوب امور میں دوسروں کی دخالت سے پاسبانی کرنا۔ ظاہراً اس رد عمل کا سبب حمیت اور عزت نفس ہے۔

غیرت کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں اہل علم و نظر میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔

مرحوم ملا احمد نراقیؒ فرماتے ہیں غیرت انسانی صفات میں وہ شرافت و فضیلت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے دین، اپنی عزت، اپنی اولاد اور اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کی حفاظت کے لئے وہ ان میں سے کسی میں بھی تجاوز برداشت نہیں کرتا ہے[2]۔

صاحب تفسیر المیزان علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں غیرت عام حالت اور اعتدال سے انسان کی تبدیلی ہے کہ یہ ایک شخص کو دفاع کرنے اور کسی ایسے شخص سے بدلہ لینے کے لئے کھڑا کر دیتا ہے جس نے اس کی کسی مقدس چیز مثلاً دین، عزت یا اس جیسی کسی چیز میں تجاوز کی کوشش کی ہو۔ یہ ایک ایسی فطری خوبی ہے کہ کوئی بھی انسان اس سے بے تعلق نہیں ہوتا لہذا غیرت انسان کی فطرت میں شامل ہے اور اسلام بھی ایک ایسا دین ہے جو فطرت کی بنیاد پر قانون سازی کرتا ہے اور ان فطری چیزوں کو معتدل کرتا ہے۔ وہ تعداد جو انسانی زندگی میں ضروری اور لازم ہے اسے معتبر اور واجب قرار دیتا ہے اور جو غیر ضروری ہے اسے ختم کر کے غیر معتبر قرار دیتا ہے[3]۔

---

[1] مجمع البحرین، جلد ۳، صفحہ ۴۳۲

[2] معراج السعادہ، صفحہ ۱۶۴

[3] تفسیر المیزان، ترجمہ سید محمد باقر موسوی ہمدانی، جلد ۴، صفحہ ۲۸۰

دوسری جگہ علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں کہ اولاً اسلام نے غیرت اور تعصب کو باطل نہیں کیا ہے بلکہ اس کی اصل کو باقی رکھا ہے کیونکہ اس کی بنیاد انسان کی فطرت ہے اور اسلام دین فطرت ہے لیکن اس کے فرعی مسائل میں دخالت کی ہے اور کہا کہ وہ غیرت و تعصب جو انسان کی فطرت کے مطابق ہے وہ حق ہے اور جو دوسرے لوگوں یا قوموں نے ایجاد کیا ہے وہ باطل ہے۔ یعنی جہاں پر بھی غیرت و تعصب خدا کی خوشنودی کا سبب ہو بہتر ہے اور جہاں خوشنودی معبود نہ ہو وہ بہتر نہیں ہے۔[1]

شہید مطہریؒ نے امیر المومنین علیہ السلام کی حدیث کہ جس میں آپؑ نے فرمایا "شریف اور غیرت مند کبھی زنا نہیں کر سکتا۔"[2] تحریر فرماتے ہیں غیرت ایک انسانی شرافت ہے اور معاشرے کی پاکیزگی کے سلسلہ میں انسانی حساسیت ہے۔[3]

علامہ مطہریؒ دوسری جگہ غیرت پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خود غرضی کے مقابلے میں غیرت کو چھوڑ دینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی انسان سے کہا جائے کہ اپنے بیٹے سے محبت نہ کرو جب کہ اولاد کی محبت انسان کی فطرت میں ہے اور یہ نہ صرف انسان بلکہ یہ محبت حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے[4]۔

غیرت کے اسباب و بنیاد کے سلسلے میں مختلف نظریات ہیں امیر المومنین علیہ السلام غیرت کی بنیاد شجاعت فرماتے ہیں، ملا احمد نراقیؒ نے شجاعت اور قوت نفس کو بتایا، علامہ طباطبائیؒ نے فطرت کو اور شہید مطہری رحمۃ اللہ علیہ نے احساس اور بشری عاطفہ کو جانا ہے۔

تاریخ بشریت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں انبیاء و مرسلین اور ائمہ معصومین علیہم السلام سب سے زیادہ غیرت مند تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے باپ ابراہیمؑ غیرت مند تھے اور میں ان سے زیادہ غیرت مند ہوں[5]۔ حضورؐ کی اس حدیث سے آپؐ کی غیرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاص شاگرد یعنی امیر المومنین علیہ السلام نے آپؐ کی غیرت کے سلسلے میں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کبھی دنیا کے لئے غضبناک نہیں ہوتے تھے، آپ جب بھی حق کے لئے غضبناک ہوتے تو کوئی آپؐ کو پہچان نہیں سکتا تھا اور جب تک آپ کا ساتھ نہیں دیتا تب تک اپ کا غصہ ختم نہیں ہوتا تھا[6]۔

کتب تاریخ میں بہت سی مثالیں ہیں جو حضورؐ کی غیرت مندی کی غمازی کرتی ہیں۔ جن میں سے چند کی جانب اشارہ مقصود ہے۔

ا۔ دشمن کے ایک اسیر کو اس کی غیرت کے سبب آپؐ نے آزاد کر دیا[7]۔

---

[1] تفسیر المیزان، ترجمہ سید محمد باقر موسوی ہمدانی، جلد ۴، صفحہ ۶۷۴

[2] غرر الحکم و درر الکلم، صفحہ ۲۵۹، حدیث ۵۵۳۴؛ مستدرک الوسائل، جلد ۱۴، صفحہ ۳۳۱

[3] مسئلہ حجاب، صفحہ ۶۴

[4] مسئلہ حجاب، صفحہ ۶۲

[5] وسائل الشیعہ، جلد ۲۰، صفحہ ۱۵۴، حدیث ۲۵۲۸۸

[6] المحجۃ البیضاء، جلد ۵، صفحہ ۳۰۳

[7] خصال، شیخ صدوق، جلد ۱، صفحہ ۳۱۳.

۲۔ اعلان بعثت سے قبل حلف الفضول میں آپؐ کی شرکت[۱]۔

۳۔ غزوہ قینقاع اسی غیرت کے سبب وقوع پذیر ہوا کہ جب ایک یہودی نے ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی چاہی تو غیرت محمدی نے یہودی کی اس جسارت کو برداشت نہیں کیا[۲]۔

۴۔ اسی غیرت کے سبب حضورؐ نے حکم بن ابی العاص اور اس کے بیٹے مروان کو مدینہ منورہ سے باہر نکال دیا[۳]۔

سرکار ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے متعدد مقامات پر غیرت کی بنیاد ایمان بتایا ہے۔ ''ان الغیرہ من الایمان'' (بے شک غیرت ایمان سے ہے۔[۴])، ''الغیرہ من الایمان و البداء من النفاق'' (غیرت ایمان سے ہے اور بے غیرتی نفاق سے ہے[۵]۔)، اسی طرح آپؐ نے فرمایا: ''ان اللہ تعالیٰ یحب من عبادہ الغیور'' (بے شک اللہ غیرت مند بندوں سے محبت کرتا ہے[۶]۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت و سیرت کی روشنی میں غیرت کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ ناموس کے سلسلہ میں غیرت۔

۲۔ دین کے سلسلہ میں غیرت

اسی طرح غیرت کبھی مثبت ہوتی ہے یعنی خدا پسند اور کبھی منفی ہوتی ہے یعنی وہ تعصب جو خدا کو ناپسند ہے اور اس سلسلہ میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام ہمارے لئے نمونہ عمل ہیں آپ حضرات نہ کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے ناراض ہوئے اور نہ ہی کبھی دنیا کے لئے کسی سے برسرپیکار ہوئے بلکہ جب بھی کسی سے ناراض ہوئے تو دین کی خاطر ناراض ہوئے۔

ممکن ہے یہ سوال ذہن میں آئے کہ جب مولا علی علیہ السلام کی حکومت اور باغ فدک غصب ہوا تو کیوں اہل بیت علیہم السلام نے اعتراض و احتجاج کیا؟ تو اس میں بھی دین ہی محور تھا کیوں کہ حکومت اہل بیت علیہم السلام کا مقصد نہیں بلکہ عدل کو قائم کرنے کے لئے وسیلہ تھا۔ اسی طرح باغ فدک کا حصول بھی مقصد نہیں بلکہ وسیلہ تھا تاکہ اللہ کے ضرورتمند بندوں کی حفاظت و کفالت کی جا سکے۔

---

[۱] فروغ ابدیت، جلد ۱، صفحہ ۱۸۴

[۲] سیرہ رسول خدا، جلد ۱، صفحہ ۵۰۳

[۳] سقیفہ، علامہ سید مرتضیٰ عسکریؒ، صفحہ ۱۵۶.

[۴] وسائل الشیعہ، ج ۲۰، ص ۱۵۴

[۵] مستدرک الوسائل، جلد ۱۴، صفحہ ۲۳۴

[۶] کنزالعمال، جلد ۳، صفحہ ۳۸۶

غیرت کے مقابلے میں بے غیرتی ہے اور جس طرح غیرت ایمان، شجاعت، احساس، قوت نفس اور بشری عاطفہ کے سبب ہے اسی طرح بے غیرتی ایمان میں کمزوری یا فقدان ایمان، بزدلی، نفس کی اسیری اور بشری نفرت کے سبب ہے۔

وہ انسان بے غیرت ہے جس کے پاس کردار، پاک دامنی، خواہشات نفسانی کی مخالفت کا جذبہ اور گناہوں کے ترک کرنے کی ہمت نہ ہو۔

بات آگئی تو بیان کر دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ عصر غیبت میں جب فقیہ کی تقلید کے سلسلہ میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی حدیث: **فأما من كان من الفقهاء صائنا لنفسه، حافظا لدينه، مخالفا لهواه، مطيعا لامر مولاه فللعوام أن يقلدوه.** یعنی فقہاء میں سے جو اپنے نفس کو بچانے والا، دین کا محافظ، خواہشات نفسانی کا مخالف اور حکم مولا کا پابند ہو تو عوام کو چاہئیے کہ اسکی تقلید کریں[1]۔ پر غور کریں تو اس میں ایک مرجع تقلید کے جو شرائط بیان کئے ہیں ان سب کا تعلق غیرت سے ہے، یعنی عوام کو چاہئیے کہ ایک غیر تمند کی تقلید کریں، ایک غیر تمند سے دین لیں، ایک غیر تمند کو اپنا رہبر و رہنما سمجھیں۔

ایک بے غیرت انسان نہ خدا سے شرم کرتا ہے، نہ اپنی ناموس کی حفاظت کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کی ناموس کے سلسلہ میں احتیاط کرتا ہے، جس سے یہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ غیرت اہل ایمان کا خاصہ ہے جس کا ایمان جس قدر قوی ہے وہ اس قدر غیر تمند ہے اور جس کا ایمان جس قدر کمزور ہے وہ اسی کے مطابق بے غیرت ہے۔

اہل علم و نظر نے قرآن و احادیث کی روشنی میں مندرجہ ذیل باتوں کو بے غیرتی کے اسباب میں شمار کیا ہے۔

۱۔ خدا اور قیامت پر ایمان نہ ہونا۔

۲۔ سور کا گوشت کھانا۔ کیوں کہ غیرت و بے غیرتی کا تعلق صرف انسانوں سے نہیں ہے بلکہ حیوانات سے بھی ہے۔ حیوانات میں مرغ غیر تمند ہوتا ہے اور سور بے غیرت ہوتے ہیں، لہذا سور کا گوشت کھانے والا بھی بے غیرت بن جاتا ہے۔

۳۔ برا گھرانہ

۴۔ برے ہمنشین اور برے دوست و احباب

۵۔ جوا اور قمار کے آلات کا استعمال اور الکوحل کا کھانا

۶۔ شراب نوشی

۷۔ بے حجابی اور برہنگی

۸۔ تذکیہ نفس کا نہ ہونا، خود کی تربیت نہ کرنا

۹۔ حرام غذا کا کھانا

---

[1] تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام جلد ۱، صفحہ ۳۰۰

۱۰۔ گناہ پر تکرار اور توبہ میں کوتاہی کرنا۔

آج اگر ہم دنیا پر نظر ڈالیں تو جدھر نظر اٹھائیں ظلم ہی ظلم نظر آتا ہے۔ کہیں گولی، کہیں میزائیل، کہیں بم، کہیں قید و بند، کہیں پیاس سے تڑپتی انسانیت، کہیں بھوک سے تڑپتے بچے، کہیں یتیموں کے آنسو تو کہیں بیواؤں کی فریاد، کہیں جسم و بدن پر ستم تو کہیں فکر و روح پر غلبہ۔ ہر جانب ظلم ہی ظلم ہے۔ جدھر دیکھیں ظلم کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ ہے۔

۷۵ برسوں سے قبلہ اول کے مجاور مظلوم فلسطینی ان یہودیوں کے ظلم کا شکار ہیں جن کو انہوں نے رحم کھا کر پناہ دی تھی، پناہ دیتے وقت فلسطینی یہ بھول گئے تھے کہ یہ یہودی جس کلیم الہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھتے ہیں جب یہ ان کے نہ ہوئے تو فلسطینیوں کے کیا ہوں گے، جس نبیؑ نے ان کو ذلت و رسوائی سے نکال کر عزت و احترام بخشا تھا جب انکی کی نافرمانی میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تو ان سے کسی خیر کی امید عبث ہے۔ جن سانپوں کو پالا تھا وہی آج ڈس رہے ہیں۔

۱۹۴۸ میں یہودی دین کے نام پر سرزمین فلسطین پر ایک ملک بنا جسے اسرائیل کہتے ہیں اور اس سے ایک سال قبل ۱۹۴۷ میں مسلمانوں کے نام پر پاکستان بنا، دونوں جگہ کے حالات ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ فلسطین کے سنّی مسلمانوں نے صیہونیوں پر رحم کھایا اور آج انہیں صیہونیوں کے ظلم کے سبب خود رحم کے طلبگار ہیں۔ پاکستان کی تعمیر میں جہاں بانیٔ پاکستان کا عمل تھا وہیں راجہ محمود آباد کی دولت تھی، دونوں ہی شیعہ تھے لیکن آج اسی پاکستان میں شیعہ ہی ظلم کا شکار ہیں۔ کبھی کراچی کی زمین شیعوں کے خون سے رنگین کی جاتی ہے تو کبھی کوئٹہ میں شیعہ مسجد میں بم دھماکہ ہوتا ہے اور ہزاروں شیعہ شہید اور زخمی ہوتے ہیں تو کبھی زائرین کی بس مسافروں سمیت جلادی جاتی ہے۔ کبھی ڈیرہ اسماعیل خان میں شیعوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے تو کبھی کسی اور علاقہ میں شیعوں کی ٹارگٹ کلیگ ہوتی ہے۔ پارہ چنار میں تو ظلم کی ساری حدیں ہی پار ہو گئیں۔

فلسطین میں سنّی مسلمانوں کو صیہونی قتل کر رہے ہیں، پارہ چنار میں صیہونی زادے نام نہاد مسلمان شیعوں کو قتل کر رہے ہیں، فلسطین میں چونکہ مملکت کے باہر سے حملے ہو رہے ہیں اس لئے اس غیر قانونی حملہ کو غیر قانونی سمجھا جا رہا ہے اور اس کی ہر ایک مذمت بھی کر رہا ہے لیکن پارہ چنار میں اموی و عباسی پیروکار حکومت کی مکمل حمایت سے شیعہ قتل ہو رہے ہیں اور اس قتل و خونریزی کے لئے افغانستان سے کرایہ کے طالبانی بھی بلائے جاتے ہیں لہذا وہ قانون کے دائرے میں ہے، نتیجہ میں دنیا پارہ چنار میں ہو رہے مظالم کی جانب متوجہ نہیں ہے۔

افغانستان میں بھی برسوں سے ظلم کا سلسلہ جاری ہے، طالبان و القاعدہ کے اقتدار میں انسانیت تڑپ رہی ہے، نہ جانے اب تک کتنے افغانی اپنے ملک سے فرار کر کے دوسرے ملک میں پناہ گزیں ہیں۔ لیکن افسوس مملکت خداداد کا نعرہ لگانے والی پاکستانی حکومت نے پاکستان میں پناہ گزیں افغانیوں کو انتہائی بے رحمی سے نکال باہر کر دیا، پاکستانی پولیس نے ان بے چاروں کی ضروریات زندگی کے سامان بھی چھین لئے۔

چین میں اویغور مسلمان چینی حکام کے تشدد کا نشانہ ہیں۔ گھروں کے بجائے کیمپوں میں زندگی بسر رہے ہیں، کتنے اویغور مسلمان جلا وطن ہیں۔

برما میں بھی ظلم کا سلسلہ جاری ہے، جو برما میں ہیں وہ ظلم کا شکار ہیں اور جو برما میں نہیں ہیں وہ یا تو کسی ملک کے پناہ گزیں کیمپ میں ہیں یا کشتی میں سوار حسرت سے ساحل کی جستجو کر رہے ہیں کہ آخر کوئی ملک اجازت دے تو انکا سفر ختم ہو۔

سو سال سے حرمین شریفین اور حجاز پر قابض خائن نجدیوں کا ظلم اپنی مثال آپ ہے، حرمین شریفین میں بنام توحید جنت البقیع اور جنت المعلیٰ جیسے علامات توحید منہدم کر دیئے، قطیف میں آئے دن ظلم کا سلسلہ جاری ہے۔ شیخ باقر النمر رحمۃ اللہ علیہ جیسے نہ جانے کتنے بے گناہ اب تک شہید ہو گئے۔ بحرین میں برسوں سے آل خلیفہ کا ظلم جاری ہے، یمن کی بھی صورت حال مذکورہ ممالک سے مختلف نہیں۔ شام میں داعش کے باقی ماندہ دہشت گرد دہشت گردی کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جدھر نظر اٹھائیں ظلم ہی ظلم نظر آئے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ صرف اسلام دشمن طاقتوں کے جرائم ہیں بلکہ نام نہاد اسلامی حکام کی خیانتیں بھی ہیں۔

اسلام جو دین فطرت و غیرت ہے اور مسلمان جو ایک غیر تمند قوم ہے آج اس کی بے حسی اس کی غیرت پر سوالیہ نشان ہے۔

قانون قانون ہے مسلمانوں کی بے حسی کا سبب بھی ایمان میں کمزوری بلکہ فقدان ایمان ہے، گناہوں پر تکرار ہے بلکہ حد تو یہ ہو گئی کہ خادم حرمین شریفین کی جانب سے رقص کی محفلیں منعقد ہونے لگیں، نام نہاد اسلامی بادشاہوں کی یہودیوں سے رشتہ داریاں ہونے لگیں، جوا اور شراب عام ہو گیا، بے حجابی اور بے حیائی پروان چڑھنے لگی تو ایسے عالم میں کسی سے احساس کی توقع ہی عبث ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ ایمان کا دم بھرنے والے اپنے ایمان پر نظر ثانی کریں اور اپنے اسلام کا محاسبہ کریں، خدا کی جانب پلٹ آئیں، قرآن کریم اور سنت رسولؐ پر عمل کریں۔ کیوں کہ قرآن و سنت پر عمل اور قرآن و اہل بیت علیہم السلام سے تمسک ہی نجات کا ضامن ہے۔ خدا ہمیں اپنی، اپنے رسولؐ اور اپنی حجتؑ کی معرفت عطا کرے۔

آیت اللہ سید نجم الحسن رضوی

سید رضی حیدر پھندیڑوی

بہت سے ایسے افراد ہوتے ہیں جن کے مرنے کے بعد معاشرہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا اور کچھ ایسے افراد ہوتے ہیں جن کے دنیا سے چلے جانے کے بعد معاشروں کا بہت بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں افراد میں سے فقیہ اور عالم دین ہوتا جس کی رحلت سے معاشرہ کا بہت بڑا نقصان ہو جاتا ہے در حالیکہ عالم کی موت ظاہر میں ہوتی ہے مگر حقیقت میں وہ زندہ ہوتا ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "العالم حی و ان کان میتا" عالم زندہ رہتا ہے خواہ اس دنیا سے رحلت فرما جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم کے علم سے لوگ صدیوں فیضیاب ہوتے رہتے ہیں اور وہ اس طرح زندہ ہوتا ہے۔ علماء اپنی علم رسانی، عزم، ہمت اور ثبات قدمی سے بنیاد انسانیت کو محکم رکھتے ہیں اور اسلام کی جڑوں میں آبیاری کرتے رہتے ہیں واقعایہ ایسے قلعے ہیں جن کی رحلت کے بعد شیطان یا شیطان فطرت افراد خوش ہوتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ (ع) قَالَ مَا مِنْ أَحَدٍ يَمُوتُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَحَبَّ إِلَى إِبْلِيسَ مِنْ مَوْتِ فَقِيهٍ" شیطان کسی مومن کی موت پر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا عالم فقیہ کی موت پر خوش ہوتا ہے[1]

جب کوئی عالم رحلت کرتا ہے تو شیطان بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے یہ ہی علماء ہیں جو اسلام کے مضبوط اور محکم قلعے ہیں اور اپنے علم کی روشنی سے لوگوں کو گمراہی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ امام موسی کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں جب کوئی مومن فقیہ مرتا ہے تو اس پر ملائکہ اور زمین کے وہ مقامات کہ جہاں وہ عبادت کیا کرتا تھا اور آسمان کے وہ دروازے کہ جن سے اس کے اعمال صعود کرتے تھے روتے ہیں اور اسلام میں ایسا رخنہ پڑ جاتا ہے کہ جس کی کوئی بھر پائی نہیں کر سکتا کیونکہ علماء اسلام کے قلعے ہیں۔ ۱۷ صفر ۱۳۵۷ھ کو دنیائے شیعیت نے سرزمین لکھنؤ پر اسلام کا وہ قلعہ (کہ جس نے مدرسہ عالیہ رامپور اور مدرسہ ناظمیہ و مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے علمی دنیا کو منور کر رکھا تھا) غروب ہوتے ہوئے دیکھا اور شیعیت پر فضائے غم طاری تھی زمانہ اسی قلعہ کو نجم العلماء آیت اللہ سید نجم الحسن امروہوی کے نام سے یاد کرتا ہے، آیئے ان کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

آیت اللہ نجم الحسن صاحب سنہ ۱۲۷۹ھ میں امروہہ کی سرزمین پر پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام مولانا اکبر حسین صاحب عبرتؔ امروہوی تھا اور آپ کی والدہ پھندیڑی سادات کے ایک دیندار خانوادہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ نجم الحسن صاحب کو نجم

---

[1] کافی ج ۱ ص ۳۸

الملت، شمس العلماء اور حکیم العلماء کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نجم الملت صاحب نے ابتدائی تعلیم مولانا سید تفضل حسین سنبھلی سے مرادآباد اور کانپور میں حاصل کی مولانا سید تفضل حسین ایک مقدس عالم تھے جو سرکاری مدرسہ میں عربی زبان کے استاد تھے مولانا سید تفضل کا مرادآباد سے کانپور تبادلہ ہوا تو آیت نجم الحسن صاحب کے والد نے ان کی ہمراہی میں آپ کو بھیج دیا تھا۔ آپ کانپور میں مولانا تفضل سے کسب فیض کرتے رہے اور گاہی بہ گاہی مفتی محمد عباس کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے رہتے تھے۔ آیت اللہ سید نجم الحسن (نوراللہ مرقدہ الشریف) اپنی خودنوشت سوانح حیات میں تحریر فرماتے ہیں: گوال ٹولی کانپور میں مولانا سید تفضل صاحب کی ہمراہی میں جناب مفتی صاحب قبلہ کی خدمت میں شرفیاب ہوا کرتا تھا اور جناب مفتی صاحب میرے حال پر نہایت شفیق تھے اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ آپ کی شادی ۱۶ سال کی عمر میں حضرت مفتی محمد عباس موسوی صاحب کی دختر سے ہوئی۔ آپ اپنی خودنوشت میں تحریر فرماتے ہیں: میرے والد ماجد اور جناب مفتی صاحب سے جناب مولوی سید اعجاز حسین صاحب امروہوی کے توسط سے باتیں ہوئی اور میری شادی جناب مفتی صاحب کے یہاں قرار پا گئی۔ ماہ رجب کی ستائسویں شب یعنی لیلۃ المبعث ۱۲۹۵ہجری بمقام لکھنو عقد ہوا اس وقت میرا سن سولہ سال تھا۔ پھر اس کے بعد لکھنو میں منتقر ہوئے اور ۱۲۹۵ہجری سے ۱۳۰۶ہجری تک تمام اوقات مفتی صاحب سے اکتساب برکات کا عمدہ موقع ملا اور آپ نے علم حدیث، تفسیر، فقہ، اصول اور ادب میں مہارت حاصل کر لی۔

آیت اللہ نجم الحسن صاحب جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی کے بہترین شاعر بھی تھے اور عربی اشعار کے جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ آپ کے اس کلام کے چند اشعار جو آپ نے کانپور میں جناب نواب صاحب کے گھر جاتے ہوئے کہے تھے بطور نمونہ نقل کر رہے ہیں:

یالیت عتبکم کسانق حالها — تووی الضیاع وتغمر الافضالا
هی عتبة تاتی الیها شرد — حفت قدیما هیبة وجلالا
وغدا اذرا کم للبریه موئلا — ومو ملا ومعولا وثمالا
کم مکمدنال المسنی من عندکم — وانامل قدنلن ثم سجالا
لو کان ماقدکان قبل شحنتم — بندکم الاردان والاذیالا

نجم العلماء صاحب کے اساتذہ میں مفتی سید محمد عباس شوستری، مولانا ابوالحسن ابن علی شاہ، علامہ ابوالحسن ابن بندہ حسین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ آپ کو مفتی سید محمد عباس شوستری صاحب سے خاص تلمذ رہا ہے۔ آپ مفتی صاحب سے کیے گئے سوالات کے جوابات تحریر فرماتے اور مفتی صاحب اپنی تصنیفات کا املا بھی آپ ہی کو کراتے تھے۔

آیت اللہ نجم الحسن صاحب نے سینکڑوں شاگردوں کی تربیت کی جن میں مفتی احمد علی صاحب، مفتی محمد علی صاحب، آیت اللہ علی نقی نقن صاحب، حافظ کفایت حسین صاحب، مولانا فرمان علی صاحب (مفسر قرآن)، مولانا عدیل اختر صاحب، مولانا محمد ہارون صاحب مولانا سید تاثیر حسین پھندیڑوی صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آیت اللہ نجم الحسن صاحب کو عراق کے علماء سے اجازہ اجتہاد حاصل تھے جن میں سے آیت اللہ سید محمد کاظم طباطبائی، آیت اللہ شیخ عباس کاشف الغطاء اور آیت اللہ اسماعیل صدر وغیرہ کے اجازات قابل ذکر ہیں۔ آپ نجف اشرف سے واپسی کے بعد سرزمین لکھنؤ پر (جہاں پہلے سے ہی مسند اجتہاد بچھی ہوئی تھی) مسند دارالافتاء پر رونق افروز ہوئے اور مومنین کے شرعی مسائل کے جوابات دیتے رہے۔ آپ کے فتاویٰ و جوابات ماہنامہ شیعہ کھجوہ ضلع سارن جنوری ۱۹۰۵عیسوی میں اور کتاب "شریعت الاسلام" جس کو آپ کے فرزند نے مرتب کیا ہے نیز مولانا سید فدا محمد نقوی فصاحت جائسی کے سوالات پر آپ کے فتوے دیکھنے کو ملتے ہیں جو ابھی تک فصاحت صاحب مرحوم کے کتاب خانہ میں محفوظ ہیں۔

آیت اللہ نجم الحسن صاحب نے ایرانی اور ہندوستانی علمائے کرام کو اجازات سے نوازا جن میں سے آیت اللہ شہاب الدین مرعشی نجفی، آیت اللہ علی نقی نقن صاحب، مولانا شیخ مظفر علی خان صاحب اور آیت اللہ سید محمد صادق آل بحر العلوم کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ اجازات کی تفصیل کے لئے ہماری کتاب "اجازات علمائے ہند" صفحہ ۲۴۰، صفحہ ۲۸۲ اور صفحہ ۵۳۲ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے جو دانشنامہ اسلام (نور مائکرو فلم سینٹر-دہلی) میں آمادہ کی گئی ہے۔

نجم الملت کے استاد محترم "مفتی محمد عباس شوستری صاحب قبلہ" نے آپ کی استعداد اور صلاحیت کے پیش نظر آپ کو جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کا پرنسپل قرار دیا۔ آیت اللہ نجم الملت صاحب نے مزید علمی دنیا کو وسعت دینے کی غرض سے سنہ ۱۳۳۸ھ میں والیِ محمود آباد کی مدد سے مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کی بنیاد رکھی جس کے طلاب دنیا کے کونے کونے تک نور اسلام پہنچاتے رہے ہیں۔

آپ نے تمام مصروفیات کے باوجود کافی تصیفات چھوڑیں جن میں: سرادق عفت، نبوت و خلافت، توحید، محاسن و شریعۃ الاسلام وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ آقای بزرگ تہرانی نے کتاب نقباء البشر فی القرن الرابع عشر، ج۵، ص: ۴۹۷ پر کتاب شریعۃ الاسلام کو آپ کی تصنیفات میں شمار کیا ہے کیونکہ اس میں آپ کے فتاویٰ موجود ہیں۔

آیۃ اللہ سید نجم الحسن رضوی نے ۱۷/صفر ۱۳۵۷ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے انتقال کی خبر عام ہوگئی، لوگوں کا جم غفیر تشییع جنازہ میں شریک ہوا، گومتی ندی کے ساحل پر غسل دیا گیا اور جامعہ ناظمیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ آج بھی اہل علم مدرسہ ناظمیہ جاکر آپ کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے اور بلندی درجات کی دعا کرتے ہیں۔ پروردگار کی بارگاہ میں دعا ہے کہ پالنے والے علمائے کرام خصوصا مرجع کرام کو اپنی حفظ و امان میں رکھ اور آخری حجت کے ظہور میں تعجیل فرما آمین والحمد للہ رب العالمین۔

نذر وطن

میرے بھارت مرے اور میرے بزرگوں کے وطن
میرا مالک تجھے خوشحال بنائے رکھے

میرے ایمان میں شامل ہے محبت تیری فرض ہے جان سے بڑھ کر بھی حفاظت تیری
مجھ کو ہر حال میں درکار ہے راحت تیری بھارتی ہوں میں زمانے میں بدولت تیری
دشمنوں سے مجھے اللہ بچائے رکھے

میرے بھارت مرے اور میرے بزرگوں کے وطن

تیری سیماؤں پہ قدرت نے ہمالہ رکھا دشمنوں کو ترے ہر دور میں اس نے روکا
اُس کے جھرنوں سے نکلتے ہوئے ٹھنڈے دریا تیری دھرتی کو یہ ہونے نہیں دیتے پیاسا
ان کا بہنا تجھے سرسبز بنائے رکھے

میرے بھارت میرے اور میرے بزرگوں سے وطن

رب نے دھرتی کو تری اتنے خزانے بخشے باغوں اور کھیتوں سے سرسبز ہیں جنگل تیرے
تیرے دریاؤں کے پانی میں ہیں موتی ہونگے جس سے آرام سے ہوتے ہیں گزارے سب کے
تیری دھرتی پر خدا خیر کے سائے رکھے

میرے بھارت میرے اور میرے بزرگوں کے وطن

ساری دنیا کی زبانیں ہیں ترے آنگن میں ساری دنیا کے مذاہب ہیں ترے دامن میں
یعنی ہر قسم کے ہیں پھول تیرے گلشن میں سب کو باندھا ہے ترے پریم نے ایک بندھن میں
اپنے سینے سے سبھی دھرم لگائے رکھے

میرے بھارت میرے اور میرے بزرگوں کے وطن

رشیوں منیوں کی تپسّیائیں تراہیں جوبن صوفیوں سنتوں کے سجدوں سے تیرا جیون
ودّوانوں سے ترے روپ میں ہے سندرین دستکاری و کسانی ہے تیرا اصلی دھن
میرا مولا تجھے دھنوان بنائے رکھے

میرے بھارت میرے اور میرے بزرگوں کے وطن

خوبیوں سے تجھے مالک نے بھرا ہے بھارت پربتوں ندیوں درختوں سے سجا ہے بھارت

پریم جل میں ترے مٹی میں وفا ہے بھارت سچ تو یہ ہے کہ تو فردوس نما ہے بھارت

یہ تیرا حسن خدا اور بڑھائے رکھے

میرے بھارت میرے اور میرے بزرگوں کے وطن

اے میرے ملک تو دن رات پھلے اور پھولے اُنّتی تیرے ہر اک پرانت میں جھولا جھولے

اس قدر پینگ بڑھائے کہ گگن کو چھولے پھر یہ حیرت بھی بہاروں میں تری خوشبو لے

جلنے والوں سے خدا تجھ کو بچائے رکھے

میرے بھارت مرے اور میرے بزرگوں کے وطن

وطن کی محبت کسی دلیل کی محتاج نہیں!

وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، انسان جس جگہ پیدا ہوتا ہے، جہاں پل بڑھتا ہے، جن گلی محلوں میں کھیل کود کر بڑا ہوتا ہے وہاں کے در و دیوار سے مانوس ہو جاتا ہے وہاں کے ذرے ذرے سے اس کو پیار ہو جاتا ہے، وہ اپنے آبائی وطن اور اس کی یادوں کو لاکھ بھلانا چاہے نہیں بھلا پاتا۔

ہمیں خارِ وطن گلزار پیارے ہیں گلِ تر سے کہ ہر ذرے کو خاکِ ہند کے شمس و قمر جانا

رب اجعل هذا بلدا آمنا ورزق اهله من الثمرات (البقرہ)

اے پروردگار! اس شہر (ملک) کو امن و امان والا بنا اور اس کے مکینوں کو مختلف قسم کے ثمرات کا رزق عطا فرما!

اخباری تراشے

نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ کے سربراہ حجۃ الاسلام والمسلمین آقای رضا شاکری زید عزہ کا صوبہ تنگکانہ کا دورہ

نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ ہندوستان کے سربراہ جناب آقای شاکری نے ۵ جنوری ۲۰۲۴ء میں صوبہ تنگکانہ بخصوص شہر حیدرآباد کا دورہ کیا جس میں مندرجہ ذیل امور بنحو احسن انجام پائے۔

۱. حیدر آباد کے علماء و فضلاء سے ملاقات اور نشست.

۲. صوبہ تنگکانہ میں نمایندگی جامعۃ المصطفیٰ کے رابط کا تعیّن.

۳. جمہوری اسلامی ایران میں حصول علم کی خاطر عازم طلّاب کے لئے شہر حیدر آباد میں دورہ تمہیدیہ کا ایک مرکز قائم کرنے کے لئے جائزہ.

۴. دینی تعلیم کے ہمراہ عصری اور اکیڈمیک تعلیم کو ضم کرنے کے لئے بعض مدارس سے رابطہ.

۵. جامعۃ المصطفیٰ کے تعلیم نظام کو متعارف کرنے کے لئے بعض مکاتب کے عہدہ داروں سے مئٹنگ.

۶. مدارس اور مکاتب کی نصابی کتب کی فراہمی کے لئے قرارداد کا انعقاد.

۷. مسابقہ علمی "اعتقادی" کے نخبگان کی ایران میں تحصیل کے لئے پذیرش کا اعلان.

* معاونت آموزش:

خدا کے فضل و کرم سے ہندوستانی طلباء کے ایران کا سفر ناممکن ہونے کی وجہ سے اور سابقہ منصوبہ بندی کے مطابق المصطفیٰ یونیورسٹی کے محترم جنرل ڈپارٹمنٹ آف اسیسمنٹ اینڈ ایڈمیشن کے تعاون سے جنوری ۲۰۲۴ میں ماسٹر کا امتحان منعقد ہوا۔

معاونت فرہنگی:

ایام فاطمی کی مناسبت سے شعبہ ثقافت و تربیت کی جانب سے تمام مدارس کے طلاب کے لیے کتاب خوانی کا مسابقہ رکھا گیا جس میں ۵۰۰ سے زائد طلاب نے شرکت کی۔ اسی طرح جشنوارۂ قرآن و حدیث اور حفظ ہفتگی کا مسابقہ بھی رکھا گیا

* معاونت پژوہش:

بعض مدارس کو مورد نیاز کتب ارسال ہوئیں، مجلہ بصائر ۸ اور ۹ چاپ کیا، اور نمایندگی کے کتابخانہ کی جابجائی جو در حال حاضر موضوعات کے مطابق تنظیم و ترتیب ہو رہا ہے۔

* معاونت فرہنگی و تربیتی:

ایام فاطمی کی مناسبت سے شعبہ ثقافت و تربیت کی جانب سے تمام مدارس کے طلاب کے لیے کتاب خوانی کا مسابقہ رکھا گیا جس میں ۵۰۰ سے زائد طلاب نے شرکت کی۔ اسی طرح جشنوارۂ قرآن و حدیث اور حفظ ہفتگی کا مسابقہ بھی رکھا گیا۔۔۔

معاونت اہل سنت:

جامعۃ المصطفیٰ کے شعبہ گرگان میں اہل سنت طلاب کی پذیرش کے لئے راہنمائی،